سُکشن

کِشور ساہو



کشور ساہو

گلشن

مُرتّبہ

امانت ہلال

پبلشرز:- ہندوستان چترا چیمبور۔ بمبئی

قیمت:- تین ۳ روپیہ

طبع اول ۲ ہزار

جون ۱۹۵۲ء

سلطانی پریس بمبئی ۳ سے

چھپوا کر ۔ ہندوستان چترا چیمبور ۔ بمبئی سے شائع کیا۔

گُلشن

کِشور ساہو

مُصنّف کی دیگر تصانیف

"گلدستہ ساہو" گلستانِ ادب میں نادر شگوفہ کاری
دبستانِ فلسفہ کا زرین مواد اور
لطیف و بلیغ خیالات کا سرچشمہ:-

"ویرکنال" تاریخ انسانیت کا زرّیں ورق
اور عبرت آموز حیرت خیز واقعات

"رام رحیم" دلآویز تفریح و مذاق اور شائستہ
ظرافت کا نادر نمونہ :-

زیر طباعت

مرتّبہ :- امانت ہلال

پبلشرز- ہندوستان چتراچیمبور- بمبئی

عنوان

پیش لفظ

"گلشن" کے مصنف شری کشور ساہو فلمی دنیا میں چنداں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ لیکن "گلشن" چونکہ کوئی فلمی اسٹوری نہیں ہے۔ ایک ادبی شاہکار ہے۔ اس لئے ساہو صاحب سے بحیثیت ادیب، پبلک سے تعارف ضروری ہوگیا۔ ساہو صاحب ہندی کے ایک کامیاب مصنف ہیں اور آپ کی مصنفہ اکثر کتابیں پبلک میں کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ منجملہ ان کتابوں کے ایک کتاب "ٹیسو کے پھول" بھی ہے جس کا اردو ترجمہ "گلشن" کی شکل میں آپ کے پیشِ نظر ہے۔

ساہو صاحب اُن جواہر پاروں میں سے ایک ہیں اور تماشا یہ ہے کہ ہندوستانی فلمی دنیا میں صرف ساہو صاحب اکیلے ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے اندر ایک آرٹسٹ، ڈائرکٹر۔ پروڈیوسر

ایکٹر، اسٹوری رائٹر اور ادیب ہونے کے کمالات جمع کر لئے ہیں ایسے مجموعہ فلمی عناصر کے واسطے خدمتِ اردو ادب کا وقت نکال لینا اس کے ادبی دیوانہ ہونے کی روشن دلیل ہے - اندیشہ ہے کہ اگر میں ساہو صاحب کے محاسن پر کچھ زیادہ روشنی ڈالوں گا - تو مجھے بھی قصیدہ گو کا خطاب مل جائے گا - اس لئے مشک کی فروخت کے واسطے میں خواجہ عطار نہیں بننا چاہتا - اور صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہر مترجم یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ترجمہ کو مثل اصل ظاہر کرے - میں نے بھی یہی کوشش کی ہے اور میں خوش ہوں کہ میں ایک ہندی فن کار کے خیالات اور جذبات کا عکس آئینہ پیش کر رہا ہوں -

ساہو صاحب کی کتاب "ٹیسو کے پھول" افسانہ جات کا مجموعہ ہے جس میں مختلف النوع چھوٹے چھوٹے افسانے لکھے گئے ہیں - افسانہ ادب کا ایک اہم جزو ہے - جس طرح کسی شاعر کا اچھا شعر زبانِ زدِ خاص و عام ہو جاتا ہے اور بطور ضرب المثل اس کا استعمال نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہتا ہے اس طرح اگر افسانہ اپنے اندر عام خیالات کی ندرتِ ترجمانی کا مواد رکھے تو قوتِ حافظہ میں اتنا گہرا اثر رکھتا ہے کہ مدتوں بھلائے سے بھی نہیں بھولا جا سکتا - افسانوی پلاٹ میں اگر اصلاحی صلاحیت موجود ہے تو اخلاقی اصلاح کا افسانہ سنگِ بنیاد سمجھا جا سکتا ہے - ساہو صاحب نے اصلاحی اور اخلاقی پہلو کو اپنے

افسانہ جات میں کہیں نظر انداز نہیں کیا ہے ۔ افسانہ
" اُستاد کی قسم " میں طرزِ بیان کی خوبی کے ساتھ
ہندو مسلم اتحاد کا جو جذبہ پیش کیا گیا ۔ وہ موجودہ
وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کا ایک صحیح راستہ ہے۔ ایک
اور افسانہ " جلدی آنا " میں اقتصادی بد حالی کے سبب
جو انسانی زندگیاں قعرِ ہلاکت میں گر جاتی ہیں ۔ اس کی
جس انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ زمانے کی نبض اپنے ہاتھ میں لے لی ہے ۔ ہر پڑھنے والا
مفلوک الحال طبقہ سے ہمدردی کا اثر اپنے اندر محسوس
کرتا ہے ۔ ایک اور افسانہ " سراج کا سہارن پور " ہے
جس میں دکھایا گیا ہے کہ مخربِ اخلاق عادات آخر میں کس طرح
ذلت، رسوائی اور ہلاکت کا باعث بن جاتی ہیں ۔ اس افسانے
میں خیال کی جدت اور بیان کی روانی اور دل کشی کا پورا
پورا سامان مہیا ہے ۔ غرض کہ ساہو صاحب کے سب ہی
افسانہ جات کسی نہ کسی حیثیت سے اصلاح اخلاق کا
ایک دستور العمل ہے ۔

اس زمانے میں جب کہ فضا کا ذرّہ ذرّہ اردو دشمنی کا
نقیب ہے ۔ ساہو صاحب کا اردو دوستی کی طرف قدم
بڑھانا ، اردو ادب پر احسان ہے ۔ ساہو صاحب کو

محض فلمی کارندہ سمجھنا اب کھلی غلطی ہوگی — وہ ایک بلند پایہ ادیب ہیں اور ملک و قوم کے واسطے قابلِ قدر ہستی ۔

امانت ہلال

۲۰ر جون ۱۹۵۲ء

بمبئی ۱۷

پیش کش

کسی پیش کش کا حقیر یا محتشم ہونا نگاہِ پسند پر منحصر ہے نہ کہ پیش کش کے ذاتی جوہر پر۔

"گلشن" میرے افسانہ جات "ٹیسو کے پھول" کا اردو ترجمہ ہے "ٹیسو کے پھول" کی پیش کش پبلک کی پسندیدگی کا کہاں تک باعث ہوئی۔ اس کے دوسرے اڈیشن نکلنے کے بعد تیسرے ایڈیشن کی ضرورت نے یقین کی وجہ پیدا کر کے پسند عام کے خلعت سے مجھے نواز دیا۔

اردو داں طبقہ کے ذوق کا احترام جبکہ مجھ پر فرض ہو تو "ٹیسو کے پھول" کا جامہ بدلنا بھی میرا ادبی فرض تھا۔ اگرچہ اردو اور فارسی سے مجھے نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ میں ان کا دل دادہ بھی ہوں۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں ایک عرصہ سے ایک ادیب سے زیادہ فلمی ڈائرکٹر ہوں اور کسی فلمی ڈائرکٹر کی مصروفیات چونکہ واقعی مرنے کی مہلت نہیں دیتیں، اس لئے میں اب تک اردو ادب کی کوئی خدمت نہ کرسکا۔

عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ اس وقت زمانہ کی فضا اردو ادب کے واسطے سازگار نہیں ہے۔ لیکن چونکہ کسی ادب کا بقاء و قیام محض ماحول کی سازگاری یا ناسازگاری کا ہی رہین منت نہیں ہے۔ بلکہ ادب کے بقاء کا راز اُدباء کے وجود اور فقدان میں پوشیدہ ہے، اس لئے میں بغیر یہ سوچے ہوئے کہ زمانہ اردو کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس حقیر پیش کش "گلشن" کو اردو کا لباس پہنا کر پبلک کے سامنے پیش کرنے کی مسرت محسوس کر رہا ہوں اردو میں میری یہ پہلی پیش کش ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس کو کہاں تک شرف قبولیت حاصل ہوگا۔ لیکن زمانہ کسی کی مساعی کو نامشکور نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے مجھے

امید ہے کہ میری کوشش بھی ہمّت شکن ثابت نہ ہوگی اگرچہ میرا مشغلہ فلمی ہے۔ لیکن میں اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوں کہ ادب کے مزین نقوش صفحۂ روزگار پر نہ مٹنے والی سیاہی سے لکھے جاتے ہیں۔ اور وقت کا کوئی انقلاب یا زمانہ کا کوئی تقاضہ ادب اور ادیب کو نہیں مٹا سکتا۔ اوراق تاریخ کیا ہیں صرف اُدبار کے قصائد ہی تو ہیں زمانہ کی گردشیں کیا ہے۔ صرف اُدبار کی تاریخ کو دھرانے والی آوازیں۔ حکومتوں کا نظم و نسق کیا ہے۔ صرف ادبار کے اخلاقی معیار کا لفظی ترجمہ اور خود انسانی ہستی کیا ہے۔ صرف ادبائے متقدمین کے فلسفہ کا خلاصہ۔

کسی کتاب کی افتتاحی رسم پیش کش سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اور ادبی مراسم بذات خود ادب کا ایک ضابطہ ہیں۔ اس لئے میں اس افتتاح کی سعادت کے بعد اپنے محسن کا شکریہ پیش کرتے ہوئے۔ صرف حضرت ذوق کا ایک شعر اہمیت ادب کا صحیح علم بردار اور قلم بند کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

رہتا قلم[1] سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پُشت چار پُشت

کشور ساہو

"داٹیکا" چیمبور

بمبئی

---

[1] دیوان ذوق از منیر لکھنوی میں قلم کی جگہ سخن ہے۔ لیکن مضمون نگاری از اخلاق دہلوی میں "قلم" ہے۔

گُلشن

شہر کا بچہ بچہ گُلشن کے نام سے واقف تھا ۔ ہر سال جب گرمی آتی اور پچھم والی سیدھی، لمبی، لال سڑک پر بہت دھول اُڑتی دکھائی دیتی، شہر والے بھانپ جاتے کہ بلوچیوں کا وہ قافلہ پھر آرہا ہے ۔ مارے خوشی کے لوگوں کی باچھیں کھل اُٹھتیں ۔ دوسرے دن شہر کے نوجوانوں کی ٹولی صبح، شام گھومتے گھومتے پڑاؤ پر جا پہنچتی اور وہاں چکر کاٹا کرتی ۔

قافلہ کے بوڑھے سردار کرامت خاں کو اپنی گُلشن پر ناز تھا ۔ اس کے دوسرے ساتھی ہر روز اپنے خدا سے یہی دعا مانگا کرتے کہ انہیں بھی گلشن جیسی بیٹی نصیب ہو، جو اپنے حُسن و جمال پر لوگوں کو فدا کرے۔ اُنھیں اپنے قبیلے کا مال خریدنے پر مجبور کرے ۔

ہر سال کی طرح اس بار بھی جب گرمی آئی اور پچھم والی اُس سیدھی،

لمبی، لال سڑک پر بہت دور دھول اڑتی دکھائی دی، شرد جان گیا کہ شہر پر بہار آ رہی ہے۔ اس کی آنکھ پھر کتاب پر نہ جمی۔ وہ ایک نظر کھڑکی سے باہر، شہر کی طرف بڑھتے ہوئے قافلہ کو دیکھنے لگا......

مرغیوں کے پٹارے، برتن، چٹائی، بانس، رسی وغیرہ سے لدی ہوئی کالی کالی بھینسیں، سواری اور گاڑیوں سے لدے ہوئے بڑے بڑے گھوڑے، اور بھونکتے ہوئے خطرناک کتے شرد کی کھڑکی کے پاس سے گذرنے لگے۔

آگے والی گاڑی میں گھوڑوں کی باگ لئے گلشن بیٹھی تھی اور بازو میں اس کا باپ کرامت خاں، تھا۔ پیچھے والی گاڑیوں میں پانچ، چھ عورتیں، پانچ، چھ مرد اور لگ بھگ ڈیڑھ درجن بچے تھے۔

شرد نے گلشن کی تعریف بہتوں سے سُنی تھی۔ لیکن دیکھا آج ہی پہلی بار تھا۔ جب سے وہ اس نیرس شہر میں اسکول ماسٹر ہو کر آیا ہے اُسے سوائے اسکول کے طالب علموں اور ان کی کتابوں کے اور کسی چیز سے واسطہ نہیں ہوا، شرد اسکول میں ہندی پڑھایا کرتا تھا۔ اُسے ادب سے خاص لگاؤ رہا تھا۔ آٹھ مہینے پہلے تک اپنے کالج کی زندگی میں وہ شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ اُسے یاد ہے۔ اس کی دلآرہتی، عنوان شاعری کو دیکھ کر ایک دن پروفیسر شوکل نے کہا تھا: "شرد، اگر تم شاعری کی طرف خاص توجہ دو تو ممکن ہے کچھ نام پیدا کر لو۔ تمھاری شاعری میں جان ہے"۔ مگر جس دن سے شرد نے کالج چھوڑا اور پردیس کے اس شہر میں آکر ماسٹری کر لی، شاعری اس کے

پاس تک نہ پھٹکی - بہت مرتبہ گھٹائیں گھریں، بہت سی رنگین شامیں آئیں، آسمانی گنگا کئی بار نکھری، دوج کا چاند کئی دفعہ ظاہر ہوا، آنگن میں لگی ہوئی جوہی بار بار مہکتی رہی، لیکن گئے وقت کی طرح، شرد کا پُرانا جوش نہ لوٹا۔

* * *

اُس دن اسکول کی چھٹی تھی، جھولدار آرام کرسی پر بیٹھا ہوا شرد انگریزی کا کوئی ناول پڑھنے میں مصروف تھا۔ جب کہ دوپہری کے اس سنّاٹے کو چیرتی ہوئی نازک آواز میں کسی نے پوچھا:

"لے گا حضور ....، کچھ لے گا؟"

گُلشن کی آواز شرد کے کانوں نے آج پہلی بار سُنی - پردہ ہٹاتا ہوا وہ برآمدے میں نکل آیا

دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر گُلشن کھڑی تھی -

"کچھ خریدے گا، حضور؟"

"کیا لائی ہو؟ ..... دکھلاؤ"

گُلشن نے برآمدے میں داخلہ کیا اور کندھے سے لٹکا ہوا چمڑے کا بیگ اُتارتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی - وہ چھینٹ والا لہنگا بے شمار شکن کھا کر پھیل گیا۔

گلشن طرح طرح کے چاقو، قینچی، تالے، سروتے، نقلی موتیوں کی لڑیں، ملمع کی ہوئیں انگوٹھیاں وغیرہ - نکال نکال کر دکھانے لگی، مگر

شرد کی نظر اِدھر اُدھر ہی ہوتی رہی...... آخر ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی کو لے کر اُس نے پوچھا:

"اس کا کیا دام ہے؟"

"سوا روپیہ۔"

بلوچیوں کی دُونی، چوگنی قیمت بتلانے کی عادت سے شرد واقف تھا۔ وہ جان گیا کہ آٹھ، دس آنے سے زیادہ اس کی قیمت نہیں ہوسکتی وہ ہنسنے لگا۔

"آپ کیا دے گا حضور؟"

"تمھیں ٹھیک بتلا دو"

"ہم تو بول دیا۔" گلشن نے بھولی سی صورت بنا لی۔

شرد نے اندر سے پیسے لاکر گلشن کو دے دیئے۔ گلشن نے دو بار گنے ایک روپیہ چار آنے تھے۔ اُس کی نیلی چنچل آنکھوں کو بڑا تعجب ہوا اور وہ پیسوں پر سے ہٹ کر شرد کے چہرے پر جم گئیں.... شرد مسکرا رہا تھا۔

"تم نے آج ہمیں لوٹ لیا!"

"نہیں حضور، برابر بولا ہم، خدا قسم اور کیا دکھائے گا؟"

"بس، آج کے لئے کافی ہے دوبارہ آؤگی تب اور لیں گے۔"

گلشن اپنا سامان بٹورنے لگی۔ اس نے سر پر نہایت خوبصورت ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ دو کالی کالی چوٹیاں اس کے سینے پر

جو قمیض کے اندر سے ابھرا پڑ رہا تھا، لہرا رہی تھیں۔ کان میں پڑے ہوئے دو گول بالے اس کے سر کی حرکت کے ساتھ ڈول رہے تھے۔ گالوں پر پسینے کی پتلی سی لکیریں کھنچ آئی تھیں .... شرد کو گلشن کی خوبصورتی کی توہین ہوتے دیکھ اس پر ترس آیا۔

"تھوڑا پانی ملے گا، حضور، پینے کو ؟"

"ہاں، ہاں، ضرور، آؤ، اندر چلی آؤ، یہاں سخت گرمی ہے"

گلشن اپنا بیگ لئے شرد کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی شرد نے اُسے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی دے دی اور آپ تھوڑی دیر میں دوسرے کمرے سے کانچ کے ایک گلاس میں تازے لیموں کا شربت بنا لایا۔ شرد سے چھپی ہوئی ہمدردی پاکر اس خانہ بدوش دوشیزہ کا دل اس کمرے کی ٹھنڈک چھوڑ کر باہر نکلنے کو نہ ہوا۔ پر پیٹ کی آواز دل کی آواز سے زیادہ تیز ہوتی ہے ..... بیگ کندھے پر لٹکا کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور احسان مند آواز سے بولی :

"حضور بڑا مہربانی ہے۔

* * *

گلشن اب شرد کے گھر اکثر آیا کرتی اور ہر دفعہ اُسے کچھ نہ کچھ دے جاتی۔ شرد نے کبھی مول نہیں کیا۔ گلشن کو لیموں کے شربت کی عادت سی پڑ گئی۔ شرد کبھی بھول جاتا۔ تو وہ خود مانگ بیٹھتی۔

ایک دن گلشن کی نگاہ چاقو، قینچی وغیرہ کے اس ڈھیر پر گئی جو

شرد کے کمرے میں، میز کے نیچے، دن بدن بڑھتی چلی آئی تھی۔ گلشن اس ڈھیر کو دیکھ کر شرما گئی۔

"آج کیا لائی ہو گلشن؟" شرد نے پوچھا۔

"حضور کو کچھ نہیں دے گا اب — آپ تو مول بھی کرنا نہیں جانتا!"

"مول کرنا جانتا ہوں، گلشن،" شرد نے ہنس کر کہا، "لیکن تم سے مول کرنے کو دل نہیں ہوتا۔"

شرد کا یہ خیال کہ یہ بلوچی لڑکی شاید اس کا مطلب نہ سمجھ پائے گی غلط نکلا، گلشن نے شرما کر سر جھکا لیا،

یہ وہی آزاد رو گلشن تھی جو جب شہر کی گلیوں سے گزرتی اپنے ہمراہ نوجوانوں کی ایک بھیڑ لئے ہوتی۔ وہ لوگ اس سے مذاق اور تھوڑی چھیڑ چھاڑ بھی کرتے۔ گلشن ہنستی ہوئی اُن سے مقابلہ کرتی، اور ادھر دھیرے دھیرے اس کا بیگ خالی ہوتا جاتا۔ پہلے ہی سے وہ چوگنی قیمت بتاتی اور اکثر منھ مانگا دام لیتی۔ کبھی کبھی منچلوں کی طبیعت چھیڑ چھاڑ سے بھی کچھ آگے بڑھنے کو ہوتی، لیکن اس کی کمر میں لٹکا ہوا پیتل کے دستے والا چمکیلا چاقو دیکھ کر اُن کی چھاتی دہل جاتی ..... اور آج اس گلشن نے شرد کے ہاتھ کچھ بھی بیچنے سے صاف انکار کر دیا۔! شرد نے اس کے سر کو رومال پر سے ہی چوم لیا۔ گلشن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ اس کا چاقو پر تھا۔ شرد کے ہونٹ گلشن کے گلابی گال پر

اُتر آئے ..... گلشن کی آنکھ مُندنے لگیں، ہاتھ چاقو پر سے کھسکنے لگا ....!

اُس پردیسی خانہ بدوش دوشیزہ کی چھاتیوں میں سر چھپا کر آج شرد بہت رویا۔ گلشن میں اُسے ایک دنیا نظر آئی۔ اس کا سارا سونا پن اور کمی دور ہونے لگی ..... آج ہی شرد کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی، اور گلشن کی زندگی نے بھی۔

* * *

اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر جھا نے شرد کو بُلا کر طنزیہ لہجہ میں کہا:

"مسٹر شرد، آپ نے سُنا، شہر میں آپ کی کیا تعریف ہو رہی ہے؟"

شرد ایک ایسی دنیا میں رہتا تھا۔ جہاں اُسے دنیا والوں کی خبر جلدی نہیں پہنچتی تھی۔

"جی نہیں،" اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"آپ کے گھر پر گلشن نام کی کوئی خانہ بدوش چھوکری آیا کرتی ہے؟

"جی ہاں۔"

"اکثر؟"

"جی"

"آپ کا اس سے کوئی تعلق ہے؟"

شرد چپ رہا۔

ہیڈ ماسٹر نے زور سے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اس کا نتیجہ کیا ہوگا

جانتے ہو ؟"

شرد پھر چپ رہا۔

"تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

* * *

"ہم جا رہے ہیں، گلشن،" شرد نے اس طرح کہا جیسے وہ دُنیا سے کوچ کر رہا ہو۔

"کہاں، حضور ؟"

"معلوم نہیں ...... ہم نوکری سے خارج کر دیئے گئے۔"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ تم ہمارے گھر دن۔ دہاڑے آیا کرتی ہو۔" شرد۔ دھیرے دھیرے ہنسنے لگا۔ مگر وہ ہنسی بناوٹی تھی۔

گلشن نے شربت نہیں پیا۔ گلاس ویسا ہی رکھ دیا۔

شرد نے گلشن کی طرف دیکھا۔

"آپ کا وطن کہاں ہے ؟"

"وطن !"

"آپ کا مکان ــــ آپ کا ماں باپ کہاں رہتا ہے ؟"

شرد نے ہاتھ سے گلشن کی چوٹی چھوڑ دی اور اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا: وہاں۔" ..... پھر وہ میز کے نیچے سے چاقو، قینچی۔ تالوں کا ڈھیر بٹور لایا۔ اور گلشن کے بیگ میں رکھنے لگا۔

"انھیں لیتی جاؤ، گلشن، یہ میرے تو کسی کام کے ہیں نہیں، انھیں بیچ کر کچھ پیسے تم اور بنا سکتی ہو۔"

گلشن چپ چاپ دیکھتی رہی۔ شرد پھر اس کے پاس آکر اس کی چوڑیوں کو تھام کر بولا۔

"ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گی، گلشن؟"

گلشن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اِسے رکھ لو۔" شرد نے دس روپے کا نوٹ اُسے پکڑاتے ہوئے کہا مگر نوٹ لینے سے گلشن نے صاف انکار کر دیا۔

"حضور، ہم دل دیکھتا ہے، پیسہ نہیں چاہتا....."

شرد نے اس کی چوڑیوں کو دھیرے سے اپنی طرف کھینچ کر کہا!

"ہمارے ساتھ چلو گی؟"

"سچ بولتا، حضور!"

گلشن کے کندھے سے پھر بیگ کھسک گیا۔

"ہاں، مگر پھر تم لوٹ نہ سکو گی۔ سوچ لو۔ اچھی طرح... چلتی ہو؟"

گلشن کھِل اُٹھی۔ "حضور!..... حضور بڑا اچھا ہے۔ خدا جانتا آپ گلشن کو کتنا عزیز ہے!......"

شرد نے دیکھا۔ اُس کی طرح گلشن بھی دل رکھتی ہے۔ اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اُس کے لیے وہ اپنا بوڑھا باپ، اپنا

قافلہ، اپنی من مختاری، اپنی آزاد زندگی اس طرح ٹھکرا دے گی۔ مارے خوشی کے وہ گُلشن سے لپٹ گیا...... پھر اس کا ہاتھ شربت کے گلاس کی طرف بڑھا جسے اُٹھا کر اُس نے گلشن کے یاقوتی ہونٹوں سے لگا دیا۔

"دیکھو، گُلشن، تم آج سے ہمیں 'حضور' نہ کہا کرو"، گلاس خالی کرکے گُلشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب کیا کہیئے گا، حضور؟"

* * *

اُس کے بعد کئی دنوں تک لوگوں نے کرامت خان کو پاگلوں کی طرح ننگا چھرا لئے گلشن کو ڈھونڈھتے ہوئے گلی گلی پھرتے دیکھا.......

ہیرے کی انگوٹھی

پچھلے دو دنوں سے کمل اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ سودھیر کی شادی میں کون سی چیز تحفہ دے - وہ اس کا پُرانا گہرا، جگری دوست تھا اور اب اس کی شادی تھی - کمل آج بھی صبح سے بازار میں گھومتا دوکانیں چھانتا رہا کہ کوئی خوبصورت قیمتی چیز اس کی نظر میں آجائے - دو چار چیزوں پر اُس کی طبیعت آئی بھی، مگر یا تو بھدّی تھیں یا سستی -

دوپہر کو جب وہ، سونا چاندی لین، سے گزر رہا تھا - اُسے اتفاقاً کوئی بات سوجھ گئی اور جوہریوں کی دوکانوں میں کچھ ڈھونڈھنے لگا ایک جگہ آخر اُسے کچھ مِل ہی گیا - اس نے دیکھا جڑ- جواہر، نگ نگینوں سے جھلملاتی ہوئی کانچ کی الماری کے اندر، لال مخمل کی ڈبیا میں خوبصورت سی ایک ہیرے کی انگوٹھی رکھی ہوئی ہے -

"لے لو، بابو صاحب، بتلاؤں؟" کہتا ہوا، ایک ڈبلا،

پتلا، لمبا آدمی، قوس و قزح جیسی پگڑی باندھے، کمل کے سامنے کی طرف کھڑا ہوگیا اور تالا کھول کر پٹ ہٹانے لگا۔

کمل نے وہ انگوٹھی دکھلانے کو کہی، دوکان دار نے ڈبیا نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی، کمل انگوٹھی کو گھما پھرا کر دیکھنے لگا

"ایک چیز ہے صاحب یہ، ایک دفعہ لے جائیے، پشتہا پشت جائے گی"۔

"ہاں، ہے تو بیشک بڑی اچھی۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"نو سو پچیس۔"

"ٹھیک بتایئے، سیٹھ جی، یہ تو بہت ہے"

"صاحب، زیادہ تھوڑے ہی لیتے ہیں۔ آپ سے۔ اصلی ہیرا ہے۔ آپ لے تو جائیے۔ مول آپ کے پتاجی سے کر لوں گا۔ بیرسٹر صاحب کے بیٹے ہیں نا آپ؟"

"جی۔"

"بس تو پھر ——— لے جائیے!"

"دیکھو، بھائی، مال اچھا ہونا چاہیئے۔ شادی میں کسی کو دینا ہے۔"

"بھروسہ رکھیئے، بابو صاحب۔ آپ بھلے ہی دے کر بھول جائیں لیکن لینے والا عمر بھر نہ بھول سکے گا۔ لاکھوں میں ایک چیز ہے یہ۔"

کمل نے ڈبیہ رکھ لی اور ایک چک کاٹ دیا۔

دوسرے دن وہ چھندواڑہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ رات کو دس بجے گاڑی ناگ پور جنکشن پہنچی۔ یہاں پر ٹرین بدلتی تھی۔ پل کے اُس پار، دوسرے پلیٹ فارم پر، چھندواڑہ کے لئے گاڑی تیار تھی۔ قلی کے سر پر سامان رکھوا کر کمل ایک سکینڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا پہنچا۔ اُسے اس وقت بڑی بھوک لگ رہی تھی اور وقت بھی کافی تھا، قلی کو ڈبہ کے پاس چھوڑ وہ اسٹیشن کے ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا۔

ہوٹل سے لوٹ کر اس نے دیکھا۔ پلیٹ فارم پر، خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بھارت کے کئی مقاموں سے آئے ہوئے مرد، عورت اور بچے، جدا جدا طرز سے رنگ برنگی پوشاک پہنے، چل پھر، اُٹھ بیٹھ رہے تھے۔ خوانچے والے گاڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، بول بول کر دوڑ لگا رہے تھے۔ لہراتے ہوئے آدمیوں کے ہجوم میں سے جب کمل اپنے کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچا۔ تو اس نے ایک عورت کو اس میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکالے، چائے پیتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دو لڑکے گرم سوٹ پہنے، قریب ہی قندیل کے نیچے، کھمبے سے لگے کھڑے تھے، اور سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی اس کھڑکی سے ٹپکتے ہوئے حُسن کی شراب کو چاٹ جانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شاید وہ کسی کالج کے اُن طالب علموں میں سے تھے۔ جو سارا دن، ساری شام اور آدھی رات تک مطالعہ کرنے کے بعد کورس کی منحوس کتابوں سے گھبرا کر، نئے بلیڈ سے شیو کر، ہوٹل

کے ٹھنڈے پانی سے نہا، اچھے کپڑوں میں سج دھج کر آنکھ مچولی
آنکھ سینکنے اور دل بہلانے کی حسرت لئے، اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر
منڈلایا کرتے ہیں، اور ٹرین کے چلے جانے کے بعد، واپس لوٹ کپڑے اُتار
کتابوں کو سرہانے رکھ، ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر سو جاتے ہیں۔

"یار، ایک چیز ہے!" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں، چڑیا ہے تو غضب کی!" دوسرا بولا۔

کمل نے دیکھا وہ خود بت کی طرح کھڑا ایک مذاق ہوا جا رہا ہے۔
جلدی سے اپنے کو سنبھال کر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی
اور قلی کو پیسے دے کر رخصت کیا۔ پھر وہ دل ہی دل میں لڑکوں کے
خیالات پر ہنستا اور اپنی حالت پر شرماتا ہوا ڈبے میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد انجن نے سیٹی دی، ایک دھکا لگا اور بھک بھک
کرتا اسٹیشن پیچھے کھسکنے لگا۔

دوشیزہ نہایت ہلکے آسمانی رنگ کی مہین ریشمی ساڑی پہنے
ہوئی تھی اوپر سے ڈیزائن دار، بڑے بٹنوں والا، لیٹیسٹ فیشن
کا سویٹر کوٹ ڈال رکھا تھا۔ کانوں میں لمبے لمبے آئرنز لٹک رہے تھے
داہنے ہاتھ میں چار، چھ آٹھ چوڑیاں تھیں اور بائیں میں سونے کی ایک
چھوٹی سی رلیسٹ واچ کالے مخمل کے پٹے میں بندھی ہوئی تھی۔ پیروں
میں اونچی ایڑی والے سینڈل ڈٹے ہوئے تھے .... کمل اُسے سر سے
پاؤں تک اس طرح گھور رہا تھا۔ جیسے کوئی غیر ملکی پہلی بار آگرہ پہنچ کر

تاج محل کو گھورتا ہے۔

"آپ کہاں جائیں گے؟" یک بارگی اُس دوشیزہ نے کمل کی طرف مڑ کر پوچھا۔ وہ جھینپ سا گیا۔

"جی — میں — میں — چھندواڑہ جا رہا ہوں"

وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کمل ایک ماہ نامہ کے اوراق اُلٹنے لگا۔

اسٹیشن آنے اور جانے لگے۔ جاڑوں کی رات تھی اور چھندواڑہ لائن۔ کڑاکے کی سردی ہونے کی وجہ آج زیادہ مسافر نہیں تھے۔ بلکہ جو تھے وہی کم ہوتے جا رہے تھے۔ چھوٹی لائن پر چلنے والی وہ چھوٹی سی، سکڑی گاڑی، چھوٹے چھوٹے اسٹیشن پر تھوڑی دیر ٹھہرتی ہوئی، ہلتی، ڈولتی، جھومتی چلی جا رہی تھی۔

"اسے اُٹھا دوں؟" دوشیزہ نے کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے کمل سے پوچھا "آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ... ہوا بڑی سرد ہے!"

"جی ہاں، بڑی ٹھنڈ ہے، لائیے میں اُٹھائے دیتا ہوں،" کہہ کر کمل نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ "سبھی نہ اُٹھا دوں؟"

"اگر تکلیف نہ ہو۔"

کمل نے ایک ایک کر کے سب شیشے اوپر چڑھا دیئے اور اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"آپ چھیندواڑہ رہتے ہیں؟" دوشیزہ نے پوچھا۔

"جی نہیں ایک دوست کی شادی میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔"

"بابو گوپال ناتھ کنٹریکٹر کے یہاں تو نہیں؟"

"جی ہاں، اُنہیں کے گھر۔ آپ اُنھیں جانتی ہیں؟"

"نام سُنا ہے"

"آپ کہاں جائیں گی؟"

"...... آپ کا کافی دور تک ساتھ دوں گی" وہ اپنی رلیسٹ واچ کو دیکھتی ہوئی مسکرا کر بولی۔

"کیا بجا ہے؟"

"ڈھائی۔"

بات کرنے کے بہانے کمل اس کے جسم پر، نیچے سے اوپر تک، ایک چیکتی ہوئی نظر پھینک دیا کرتا تھا۔ گدیدار برتھ پر آرام سے ٹک کر بیٹھی ہوئی نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔.... کمل کے دل میں درد اُٹھنے لگا۔

ایک اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو وہ اپنی سیٹ سے اُٹھکر دروازے پر آئی اُسے کھولکر باہر کو جھانکنے لگی۔

"کیا کچھ چاہیئے آپ کو؟" کمل نے پوچھا۔

"یہاں چائے مل سکے گی؟"

"ملنی تو چاہیئے۔ دیکھوں؟"

"اگر تکلیف نہ ہو۔"

"نہیں تکلیف کا ہے کی۔"

کمل اُٹھا اور اس سے چھوتا ہوا دروازے کے نیچے اُتر پڑا اور تھوڑی دیر میں ایک چھوکرے کے ہاتھ دو کپ لیوا لایا۔ دونوں نے چاء پی۔ چھوکرے کو پیسے دے کر کمل نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے اوور کوٹ کا کالر اُلٹاتا ہوا سیٹ پر آبیٹھا۔

"شکریہ۔" دوشیزہ نے کہا اور پھر پاس ہی چمڑے کے سوٹ کیس پر پڑا ہوا کمبل اپنے پیروں پر کھینچ کر وہ کمل کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

بول چال، رنگ ڈھنگ، طور طریقے سے وہ یو۔پی، کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی مگر تھی الٹرا موڈرن ——— پردہ، جھجھک، حیا سے کوسوں دور۔ ایسے نایاب موقع کو کھو دینا کمل نے مناسب نہ سمجھا۔

گاڑی اس پہاڑی ملک کی سرد ہوا میں کانپتی، چاندنی میں نہاتی، گڑگڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور اس کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں، آمنے سامنے بیٹھے ہوئے، دو جانیں، آنکھوں آنکھوں میں کوئی دل کی بات بول رہے تھے۔

"کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟" کمل اس انوکھی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔

وہ پھر مسکرائی ۔ "بہت دور سے"، اُس نے کہا ۔

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے"، کمل نے کچھ شکایت کے طور پر کہا ۔ "میرا مطلب شہر سے تھا ۔ بمبئی، کلکتہ، بنارس، لکھنؤ، کان پور ـــــ ؟"

اُس نے سر ہلا کر "نہیں"، جتایا،

"دِلّی ؟"

اُس نے پھر سر ہلا دیا ۔

"لاہور ؟"

"اور اوپر چلیے ۔"

"پشاور ؟"

"اوہوں"

"کابل ؟"

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی ۔ "دِلّی سے"، اس نے کہا ۔

"آپ کے ساتھ اور کوئی ہیں ؟"

"نوکر ہیں ۔"

"کہاں ؟"

"دوسرے ڈبہ میں ۔"

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں ؟ کیا کرتی ہیں آپ دلّی میں ؟"

"آپ ایک دم بہت کچھ جان لینا چاہتے ہیں !" ۔ اُس کی آنکھو

میں بدلی چھائی ہوئی تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ جھول رہی تھی۔

کمل جھینپ کر چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر آنکھیں چار ہوئیں، کمل کی طرف وہ اُسی نگاہ سے دیکھ رہی تھی جس کا مطلب کچھ نہیں اور سب کچھ ہو سکتا تھا۔ کمل یکبارگی اُٹھا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ برابر کمل کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پل بھر بعد، کمل پھر سے اپنی برتھ پر جا بیٹھا اور ایک کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا کر اس نے بہت سی ٹھنڈی ہوا اندر لے لی۔ پھر، سگریٹ سلگا کر اُسی ماہ نامہ کے ورق اُلٹنے لگا۔ دل میں اُس کے ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دماغ میں طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنی جلدی اس پر وہ ریجھ گیا ہے — کیا اس دوشیزہ کا بھی یہی حال ہو گا؟ اگر نہ ہوتا تو کیا وہ چپ رہتی؟ اس کی آنکھوں میں کیا محبت نہیں جھلک رہی ہے؟ مگر اتنی جلدی کوئی کسی کی محبت میں پڑ بھی سکتا ہے۔ طرح طرح کی دلیلیں۔ اُس کے دل میں پیدا ہونے لگیں دیکھے، سُنے اور ناولوں میں پڑھے ہوئے ایسے تمام واقعات اس کے سامنے ایک ایک کر آنے لگے۔ جہاں کہ نظر ملتے ہی ہیرو، ہیروئن میں جس طرح محبت پیدا ہوتی ہے، کیا وہ کسی دن اُسے اپنا بنا سکے گا؟ کتنا سُکھی ہو گا۔ اُس کا جیون اگر وہ ایسا کر سکا تو! شام کو جب وہ گھر لوٹا کرے گا۔ کس طرح دروازے کی آڑ میں وہ چھپی کھڑی رہا کرے گی! اور دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال

کس طرح اس پردہ کو دبڑا کرے گی ! اور کس طرح ——
کمل نے محسوس کیا کہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا کانپ رہا ہے۔ ہوش میں آکر اُس نے کانچ پھر اوپر چڑھا دیا۔ اسی وقت' پھر' سے کوئی چیز بجی۔"

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سوئی ہوئی تھی اور کمبل نیچے گرا پڑا تھا۔ وہ اپنی برتھ سے اُٹھ کر اُڑھانے لگا۔ وہ جاگ پڑی.....

کمل نے دیکھا ایک نہایت ہی حسین صورت، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، سامنے پڑی ہوئی مہک رہی ہے۔ اس کے لہراتے ہوئے کالے گیسو ماتھے کے زائد حصّے پر چھاکر، ایک آنکھ ڈھنک لی تھی۔ کمل اس کے چکنے، ملائم، انگوری چہرے پر بڑی دیر تک نظر بچھائے رہا۔ پھر دھیرے دھیرے منھ پاس لے جاکر اُس کے ہونٹوں کو اس نے چوم لیا۔ دوشیزہ نے اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے

"نام نہ بتاؤ گی؟" کمل نے پوچھا۔

"نا۔"

"کیوں؟"

"ضرورت نہیں۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"جہاں آپ جا رہے ہیں۔"

"سچ؟"

جواب میں اس نے سر ہلا دیا۔ کمل نے اُسے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا۔

پو پھٹ رہی تھی اور ڈھیر کا ڈھیر دھندلا نارنگی روشنی، کھڑکی کے کانچ سے چھنتا ہوا آکر، اُن دونوں پر پڑ رہا تھا۔

"جب میں نے پہلی بار تمھیں ناگپور اسٹیشن پر دیکھا تھا تب مجھے ذرا بھی یہ خیال نہیں ہوا تھا" کمل اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر، اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا "

"کہ میں اتنی جلدی ــــ اُلجھ جاؤں گا۔"

"اور اب ؟"

"اب ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو میں تمھاری محبت میں سر تک ڈوب چکا ہوں۔ تم نے بڑی جلدی اثر کیا !"

"اور میں سمجھی تھی کہ شاید آپ پر بالکل اثر نہ کر پاؤں گی۔"

"کیوں ؟ ایسا سمجھنے کا کیا ــــ ؟"

"مگر دیکھتی ہوں کہ اگر کوشش کی جائے تو اثر ہو ہی جاتا ہے۔ ہماری طرف سے بس ذرا اشارہ بھر کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ آپ لوگ تو ہر دم تیار رہتے ہی ہیں۔"

"کس بات کے لئے ؟"

"یہی ــــ کسی کی محبت میں سر تک ڈوب جانے کو۔"

"خیر، مذاق چھوڑیئے۔" کمل اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لے کر مسلنے لگا، "بولو مجھ سے شادی کرو گی؟"
بھوچکی سی ہو کر وہ اُسے دیکھنے لگی، پھر زور سے ہنس پڑی۔
"بولو نا؟"
"آپ سے؟ ابھی تو آپ نے مجھے برابر جان بھی نہیں پایا ہے!"
"ضرورت سے زیادہ جان گیا ہوں۔" کمل نے اُسے اور بھی پاس کھینچ لیا۔
"میں اِتنا جانتا ہوں کہ میں تمھیں چاہتا ہوں۔ تمھارے بغیر..."
"مگر میں تو آپ کو نہیں چاہتی۔"
"تم جھوٹ بول رہی ہو" کمل ایک دم بول پڑا۔ "بولو نا، مجھ سے شادی کرو گی؟"
"پاگل تو نہیں ہو گئے؟"
"تم تو بات اُڑا رہی ہو۔ ذرا......"
"اوئی!" وہ ایکا ایک چیخ اُٹھی — "ذرا دیکھئے!"
اُس نے تڑپ کر کہا — اور اپنے کو کمل کے باہوں سے چھڑانے لگی۔
"مجھے — مجھے کچھ چبھ رہا ہے! چھوڑیئے بھی — کوئی چیز گڑ رہی ہے!"
"کیا ہے؟" کمل نے تعجب سے پوچھا — کیا ہو گیا؟
"آپ کے کوٹ میں کوئی چیز....."
"اوہو! مجھے معاف کرو،" کہتے ہوئے کمل نے اپنے کوٹ

کے اندر کی جیب سے دہی لال مخمل کی ڈبیہ باہر نکالی — یہی چُبھ رہی تھی - میں —— میں - بھول ہی گیا تھا - کیا بہت زور سے چُبھ گئی ؟"

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مُسکرانے لگی - " کیا ہے یہ ؟" اُس نے ڈبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا -

" ڈبیہ "

" اس میں کیا ہے ؟"

" انگوٹھی - اپنے دوست کی شادی میں ——"

" بطور سوغات کے لئے جا رہے ہیں ؟"

" ہاں - "

" میں دیکھ سکتی ہوں ؟ "

" بے شک "

اس نے ہاتھ بڑھا دیا - کمل نے ڈبیہ دے دی - ڈبیہ کھول کر اس نے انگوٹھی باہر نکالی اور بڑی دیر تک اس کو دیکھنے کے بعد اپنی انگلیوں میں پہن پہن کر پتا لگانے لگی کہ کس میں ٹھیک آتی ہے ؟

" کون سا پتھر ہے ؟ "

" ہیرا "

کمل نے اس کے انگوٹھی والے ہاتھ کو لے کر کہا -

" دیکھا نا ، تمھاری ہی طرح چمک رہا ہے "

وہ ہنس پڑی - " تو میں ہی رکھ لوں اسے اپنے پاس ؟"

اُس نے اس طرح پوچھا جیسے ٹٹولنا چاہتی ہو ـــــ اس کی آنکھوں میں آنسو ابھی تک جھلک رہے تھے۔

" میرا امتحان لینا چاہتی ہو۔؟"

" جو سمجھئے ۔" ــــــــــــ

" رکھ لو بڑی خوشی کے ساتھ ۔"

وہ پھر کمل سے لپٹ گئی - اسی وقت ' چھیندواڑہ ـــــ چھیندواڑہ ' کی آواز آئی ۔ گاڑی دھیمے ہو کر رُکنے لگی۔

" کہاں ٹھہر دگی ؟" کمل نے بے چینی سے پوچھا - " مجھے پتہ بتا دو، ویسے میں ملوں گا ۔"

" میں خود مل لوں گی " اس نے کہا ، اور اُٹھ کر اپنی ساڑی ٹھیک کرنے لگی -

" کہاں ؟"

" آپ کو اس سے مطلب ؟ کہہ دیا ، مل لوں گی ۔"

" کب ؟"

" یہی ، آج کل میں ۔"

" دونوں نیچے اُتر پڑے ۔ قلیوں نے سامان اُتارا۔

" تو یہ ـــــ "

" ہاں ، پکار رہا ، " کہتی ہوئی ، مُسکرائی ، کمل پر آخری بار

نظر پھینکتی، قلی کو ساتھ لئے، وہ گاڑی کے ایک تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ جہاں دو تین آدمی، جو لباس سے اس کے نوکر چاکر معلوم ہوتے تھے۔ بہت سے سامان کے ساتھ، شاید اس کی راہ دیکھتے کھڑے تھے۔

کمل محو ہوکر اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ جبکہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک پڑا۔ پیچھے مڑکر دیکھا، سودھیر کھڑا تھا۔

"اوہو!" اس نے کہا۔ "سودھیر! تم! ... میں تو سمجھا تھا کہ تم اسٹیشن پر نہ آسکو گے۔"

"مگر دیکھا، آہی گیا ہوں — تمھاری خاطر۔ چلونا، کھڑے کیوں ہو؟"

"چلو۔"

دونوں آکر موٹر میں آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ قلی سامان لاکر پیچھے رکھ گیا۔ دوسرے لمحہ موٹر چل پڑی۔

کمل نے دیکھا سودھیر شادی کے کپڑے پہنے ہوئے آیا تھا اور اس کے ہلدی بھی لگی ہوئی تھی۔ اُسے فوراً انگوٹھی کی یاد آگئی۔ سودھیر کیا سوچے گا۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ اس کے لئے لائی ہوئی بھینٹ اس نے ایک انجان دوشیزہ کو تھوڑی دیر کے پہچان میں دے ڈالی؟ مگر ہر ایک گہری محبت کی جڑ میں کیا لمحہ بھر کی ہی پہچان نہیں ہوا کرتی؟ کیا اس نے کوئی بڑا بیجا کام کر ڈالا؟ سودھیر

کے لئے دوسری چیز وہ یہیں خرید کر دے دیگا - بس، بات ختم ہوئی ۔ نہ اصل بات سودھیر ہی کو معلوم ہوگی اور نہ اُسے بُرا ہی لگے گا -

"وہ، کون تھی ؟" سودھیر نے کمل کے کھوئے ہوئے چہرے پر دیکھ کر پوچھا -

"کون ؟"

"جو تمھارے کمپارٹمنٹ سے اُتری تھی -"

"مجھے خود نہیں معلوم -" کمل کپکپانے لگا -

"یعنے ؟"

"اس نے نام نہیں بتایا -"

"اکیلی تھی ؟"

"ساتھ میں نوکر بھی تھے ــــ دوسرے ڈبے میں -"

"کہاں ٹھہری ہے ؟"

"معلوم نہیں -"

"کیا کرتی ہے، کہاں رہتی ہے، آخر کچھ تو تم نے پوچھا ہی ہوگا ؟"

"پوچھا تو بہت کچھ تھا لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں - صرف اِتنا کہا، دِلّی سے آرہی ہے - وہاں شاید کالج میں پڑھتی ہوگی اور چھٹیوں میں لوٹ رہی ہے ......لیکن ...... لیکن وہ تو

شاید تمھیں جانتی ہے۔"

"مجھے؟"

"ہاں، کہتی تو تھی کہ تمھارا — تمھارے پتاجی کا نام سُنا ہے۔"

سودھیر متعجب ہو کر کمل کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا، دو — اور — دو — چار کی نگاہ سے دیکھ کر بولا، "دِلّی سے؟"

"دکھا تو اس نے یہی تھا۔"

"اچھا! تو —" سودھیر ہنسنے لگا:

"جانتے ہو نا؟"

"شاید۔"

"یہیں کی رہنے والی ہے؟ کون ہے وہ؟ کہاں ٹھہری ہے؟"

کمل نے سوالات کی جھڑی لگادی۔

"پہلے یہ تو بتاؤ،" سودھیر نے اُسے ٹھیل کر کہا، "کہ تم سے کب، کہاں، کس طرح ملاقات ہوگئی؟ کیا کہتی تھی؟"

کمل اُسے سارا قصہ مختصر طور سے سنانے لگا، سودھیر ہنستا ہوا، دونوں کان کھلے رکھ کر، دھیرے دھیرے موٹر لیے جا رہا تھا کہ بات ختم ہونے سے پہلے کہیں منزل نہ

طے ہو جائے۔

"اچھا، تو ایک ہی جلوے میں،" سودھیر آخر بول اُٹھا، "آپ اُس پر قربان بھی ہو گئے! نظر ملاتے ہی دل بھی دے دیا! لیکن دیکھا، کمل —— میرے عاشق مزاج کمل —— تمھیں کیا حق تھا کہ میرے لئے لائی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی اُس لونڈیا کو، جس کا نام گام، ذات پات، ٹھور ٹھکانا کچھ نہیں معلوم۔ تم نے دے ڈالی؟"

"تم نہیں جان سکتے سودھیر، محبت میں آدمی کس طرح پاگل ہو جاتا ہے۔"

"شاید تمھارے کہنے کا مطلب ہے کہ پاگل آدمی اسی طرح محبت کرتا ہے —— کیوں؟"

"خیر جو سمجھو۔ مگر تم تو اُسے جانتے ہو نا؟"

"رام نہ کرے میرا اندازہ ٹھیک نکلے۔"

"کیوں؟"

"ہاں، تو اب کیا ارادہ ہے؟"

"اس کا پتہ لگانا ہے۔ اُسے ڈھونڈھ نکالنا ہے۔"

"اور پھر؟" کمل کی بیتابی اور پریشانی دیکھ کر سودھیر سے ہنسی روکے نہیں رُک رہی تھی۔

"میرا مذاق اڑا رہے ہو، سودھیر!" کمل ذرا بگڑ کر

بولا:

"میں بہت غمگین ہوں۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ بات بہت غمناک ہو چکی ہے ــــ خاص کر تمہارے لئے۔"

اِسی وقت موٹر ایک عالیشان مکان کے سامنے سجے ہوئے منڈپ کے پاس آکر رُک گئی۔ سودھیر نے کمل کو نیچے اُترنے کیلئے کہا اور خود بھی اُتر پڑا۔

"تمھیں سب معلوم ہو جائے گا، چلو اندر چلو"

اُس نے کہا۔ تمام دن سودھیر کا سجنے، سنورنے میں بیتا۔ ہر گھڑی وہ بے چارہ یار لوگوں سے گھرا پھبتیاں جھیلتا رہا۔ یار لوگوں میں کمل کا بھی شمار تھا۔ مگر کھیل کود، ہنسی مذاق میں وہ دل کھول کر حصّہ نہ لے سکا۔ اُسے کچھ اور ہی لگی تھی۔ سودھیر سے اکیلے میں کچھ بولنے، پوچھنے کا موقع ہی نہیں مِلا۔ شام کو سودھیر کے ساتھ وہ موٹر میں گھومنے جانے والا تھا۔ مگر وہ بھی پروگرام کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا۔ رات کو اس سے برابر کھایا نہیں گیا۔ ہر گھڑی اس کا تصوّر، ہر وقت اسی کی یاد بنی رہی۔

کمل کی بے چینی سودھیر سے چھپی نہ تھی۔ وہ دل ہی دل میں اُس کی حالت پر ہنستا رہا۔

کھانے کے بعد، لوگ ناچ میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ کوئی نئی ریشمی قمیص پہن رہا تھا، کوئی بال سنوار رہا تھا، کوئی رومال پر سینٹ چھڑک رہا تھا، کوئی بٹوے میں روپئے گن رہا تھا۔ سودھیر اور اس کے ساتھیوں کی التجا پر کمل نے بھی آخر زہرہ جان کے مجرے میں شریک ہونے کے لئے قبول کر لیا۔

آدھی رات کے بعد، بابو گوپال ناتھ، بڈھی پلٹن، کو لے کر محفل سے ہٹ گئے ——— اور نیا خون جوش میں آیا۔

بجلی کی روشنی سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کے سر ہل رہے تھے، واہ واہ، کا شور اٹھ رہا تھا.... اور گھنگرو کی رُم جھم کے ساتھ بائی جی مست ہو کر الاپ رہی تھیں ——"سیج چڑھت موری پائل باجیں——"

کمل اور سودھیر بھی کمرے میں داخل ہوئے اور غالیچے پر جا بیٹھے۔ کمل، ان منا سا، گاؤتکیہ کے سہارے بیٹھا، کچھ خواب کی صورت میں، سگریٹ سلگا رہا تھا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ چونک پڑا۔ آیں! یہ تو وہی پرانی آواز! وہی لوچ، وہی لٹکا، وہی مٹھاس، وہی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور کمل کے ہاتھ سے دیا سلائی

رگر پڑی ۔ سگریٹ منھ میں لگی کی لگی رہ گئی ——

ادھر طبلے کی ٹھنک بند ہوئی، گانا ختم ہوگیا! کمل نے دیکھا، پاندان لئے چھم چھم کرتی، وہ اسی کی طرف چلی آرہی ہے ۔ وہی ناز، وہی ادا، قیامت ڈھانے والی مسکراہٹ ....

"پان لیجئے" اس نے پاس آکر بڑے انداز سے کہا ۔ اُس کے داہنے ہاتھ کی دوسری اُنگلی پر ہیرے کی انگوٹھی —— کمل کی دی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی —— چمک اُٹھی ۔

کمل کا دل، تیر کھائے ہوئے ہرن کی طرح، یکبارگی اچھل کر بیٹھ گیا ۔ "تو کیا وہ یہی تھی؟" اُس نے سوچا ۔ "زہرہ!"

زہرہ جان! ایک ہرجائی! دِلّی کی مشہور —— اُس کا دماغ چکرانے لگا ۔

زہرہ جان ذرا اور آگے بڑھ آئی، پھر، پاندان سامنے سرکا کر، بجلی گراتی ہوئی بولی!

"لیجئے نا ...... پان تو لیجئے"

کمل متحیّر ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا، اور سو دھیر، پاس میں پڑی ہوئی دیا سلائی اُٹھا کر بے جلی سگریٹ

سلگانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔

پشپا

پروفیسر شیو کمار ماتھر کو آج اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہ ہوا انھیں معلوم ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ "پشپا کا تار! ناممکن ہے" انھوں نے سوچا — مگر تار پر نام تو اُسی کا ہے ..... پشپا! "میری پشپا!" گرم جوشی سے اُن کی ہتھیلیوں میں نمی آگئی۔ تار کا پرچہ اُن کے کانپتے ہاتھ میں بھیگ کر کچھ سکڑ گیا — "پشپا" انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر، بڑی محبت سے کہا اور ریڈیو کے اوپر رکھی ہوئی فوٹو فریم میں مُسکراتی ہوئی صورت کو تکنے لگے۔ "پیاری پشپا! انھوں نے تار پھر سے پڑھا — شاید بیسویں بار "شام کو میل سے پہنچ رہی ہوں اسٹیشن پر ملنا — پشپا" پرچہ کو پروفیسر صاحب نے پھر زور سے مٹھی میں کس لیا۔ ورنہ شاید

اس میں لکھی ہوئی خبر اُڑ ہی تو جاتی - پھر وہ ریڈیو کے پاس جا کر صوفہ کے ہاتھ پر بیٹھتے ہوئے اسی تصویر کو ایک ٹک دیکھنے لگے

تصویر پر نیچے کی طرف داہنے کونے میں، خوبصورت باریک حرفوں میں لکھا ہوا تھا "سدا کی تمھاری ہی پُشپا" شیو کمار کو دس سال پرانی باتیں یاد آگئیں - اس وقت وہ الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر گھر لوٹے تھے - دن بھر سونا، شام کو ٹینس کھیلنا - اور آدھی رات تک چھت پر پڑے پڑے انگریزی کے افسانے پڑھنا ہی ان دنوں اُن کا مشغلہ تھا۔

مگر ایک دن دوپہر کو اُن کی چھوٹی بہن، سدھا، ضد کرکے انھیں بیٹھک میں کیرم کھیلنے لے گئی تھی - اور تب ہی پُشپا کو انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا - پیلے رنگ کی سوتی ساڑی اور کالے ساٹن کا بلاوز پہنے ہوئے تھی - انھیں ابھی تک یاد ہے کتنی نازک کتنی چنچل، کتنی خوبصورت تھی وہ! بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی پر چندی بندھی ہوئی دیکھ کر - انھوں نے پوچھا تھا: یہ آپ کی اُنگلی کو کیا ہو گیا؟"

لیکن پشپا نے تو بولنے کی قسم کھا رکھی تھی - چندی والا ہاتھ چھپاتے ہوئے اس نے تھوڑا سا مسکرا دیا تھا - اُس کی آواز سُننے کے لئے شیو کمار نے اُسے بُلوانے کی بہتیری کوشش کی طرح طرح کی باتیں بنائیں، کبھی پوائنٹس پوچھے کبھی اسٹرائیکر

مانگا، کبھی کھیلنے میں بے ایمانی بھی کی، مگر پُشپا نہ بولی - شاید وہ تاڑ گئی تھی کہ اُسے بولوانے کی کوشش کی جا رہی ہے، تبھی تو وہ رہ رہ کر مسکرا پڑتی تھی - آہ ! بالکل اسی طرح تو وہ مسکراتی تھی جیسے کہ اس تصویر میں - کتنی مشکل سے تصویر کھنچوانے پر وہ راضی ہوئی تھی -

اُس وقت وہ تھرڈ ایر میں تھے ، دسہرے کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے - پشپا میٹرک میں پڑھ رہی تھی - تصویر کے لئے ہاں، تو کہہ دیا تھا مگر جب وہ کیمرا لے کر آئے تو وہ بھاگنے لگی لیکن دوڑ کر شیو کمار نے اُسے الماری کی اوٹ میں پکڑ ہی تو لیا - وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی - اور پھر فوراً اُسے اپنی حالت کا خیال ہو آیا -

"چھوڑو مجھے، اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مجھے جانے دو -"

"جاؤ، اگر چھڑا سکو تو ، روکتا کون ہے ؟" شیو کمار نے شرارت کے طور پر کہا -

"جانے بھی دو، شیو —— کوئی دیکھ لے گا -"

"بلا سے ——"، تبھی تو شیو نے پہلی بار پُشپا کے گالوں کو چوما تھا - ہاں، وہی تِل والا گال - شرم سے لال ہوتے ہوئے گال پر ننھا سا وہ کالا تِل اور بھی نکھر آیا تھا -

چائے کا ٹرے لے کر عبدل نے کمرے میں آکر دیکھا پروفیسر صاحب تصویر میں گم ہیں۔ اُن کے اس پرانے مرض سے وہ واقف تھا۔ پچھلے آٹھ سال کی لمبی ملازمت میں اپنے مالک کو اس نے کئی دفعہ عجیب حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ مالک نے بھی کبھی کبھی اُپشیا کے بارے میں اس سے ذکر کر، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اپنی موجودگی جتلانے کے خیال سے، چھوٹی سی اپنی کالی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، عبدل نے دو ایک بار دھیرے دھیرے کھانسا ——— مگر پروفیسر صاحب تک شاید اُس کی آواز نہ پہنچ سکی۔

"چائے حاضر ہے، سرکار،" عبدل نے کہا۔

پروفیسر صاحب تار پڑھنے لگے۔ اور پھر تصویر میں کھوگئے۔

بیٹے کو تصوّر ستا رہا ہے یار کا، عبدل نے سوچا۔ اور دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ جذبات تو اس کے پاس بھی تھے۔ مگر پروفیسر صاحب کی طرح کسی کھوئی ہوئی چیز پر ہمیشہ آنسو بہانا اُسے نہیں جچتا تھا۔ آخر اس نے بھی زندگی دیکھی تھی۔ وہ بھی جوان تھا ——— ویسے تو اب بھی وہ بڈھا نہیں۔ پہلی بیوی مرگئی تو اس نے دوسری شادی کی۔ اور اس کے بھاگ جانے پر کیا وہ روتا ہی رہا؟ ارے، عورت تو پیر کی جوتی ہے۔ ایک گئی

دوسری۔ دوسری نہیں، تیسری سہی۔ اگر پروفیسر صاحب کی معشوقہ نے کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ تو کیا اس کے لئے وہ ہمیشہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھے رہیں گے؟ آٹھ سال تو اس طرح گذار دیئے۔ اب کیا ساری عمر یہی حشر رہے گا؟"

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، غریب پرور!" عبدل نے ہمّت کر کے ذرا زور سے آواز دی۔

غریب پرور نے سُن لیا۔ دھیرے سے گردن گھما کر وہ عبدل کی طرف دیکھنے لگے۔ عبدل کی طرف۔ عبدل کو نہیں۔ اُسے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر پھر سے کھانسنا پڑا۔

"اوں؟ کون ــــ عبدل؟ کیا ہے؟" پروفیسر صاحب کو ہوش آگیا۔

"چائے لئے کھڑا ہوں، حضور، بڑی دیر سے، پھر آپ ناراض ہوں گے کہ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔"

پروفیسر صاحب ہنس دیئے "کون کہتا ہے۔ ہم ناراض ہوں گے .... بھلا تم سے؟ اور آج؟... اچھا بناؤ۔"

عبدل نے ٹرے میز پر رکھ دی اور کپ میں چائے بنا کر اُنھیں دیتا ہوا بولا۔ "گستاخی معاف ہو سرکار، بریہ تصویر پرستی بہت ہو چکی۔ اب میرے لئے ایک مالکن لا دیجئے۔ گھر بھی

آباد ہو جائے گا اور آپ کی طبیعت بھی لگی رہے گی" موقع دیکھ کر منھ لگا عبدل بہت کچھ کہہ گزرتا تھا۔

"مالکن!" پروفیسر صاحب تھوڑا سا مسکرا دیے۔" "شام کو آنے والی ہیں۔"

"آپ تو، سرکار، مذاق کرنے لگے۔ جب کبھی یہ غلام کوئی التجا کرتا ہے، آپ بات اُڑا دیتے ہیں۔"

"نہیں، مذاق نہیں، ہم سچ کہتے ہیں۔ آج شام کو آ رہی ہیں۔ یہ دیکھ تار۔"

عبدل ذرا پاس آ کر اونٹ سی اپنی لمبی گردن تار کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "کس کا ہے، حضور؟"

پروفیسر صاحب نے لِشپا کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"سچ؟" عبدل نے پوچھنا چاہا۔ لیکن مارے تعجب کے اُس کی زبان سے صاف حرف نہ نکل سکا۔ اس کا منھ ایک عجیب انداز سے کھل کر رہ گیا۔ اور اُس کی وہ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں کبھی تصویر کو اور کبھی پروفیسر صاحب کو دیکھنے لگیں۔ چوڑی دار پاجامہ میں دبلا پتلا عبدل بالکل ایک مضحکہ خیز تصویر معلوم ہو رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر پروفیسر صاحب کو ہنسی آ گئی۔ عبدل بھی ہنس پڑا۔ مالک نوکر پر ہنس رہا تھا، نوکر مالک پر۔ کچھ سنبھل کر عبدل نے پوچھا: "لیکن، حضور، اُن کی ـــــ وہ تو ـــــ

وہ تو شادی شدہ ، ہیں ! آپ نے تو ایک مرتبہ کچھ ایسا ہی فرمایا تھا ؟

" ہاں ہماری بد قسمتی !" پروفیسر صاحب نے کہا " اگر ہم ولایت نہ جاتے اور ہماری غیر حاضری کا ناجائز فائدہ اٹھا، اس کے گھر والے اُسے کسی اور سے شادی کرنے کے لئے مجبور نہ کرتے ۔ تو آج وہ تمھاری ہی مالکن ہوتی ، عبدل ! "

شیو کمار کی آواز میں درد لپٹا ہوا تھا ۔ پشپا کی شادی کی خبر سن کر اُن کے دل پر جو گزری تھی ۔ وہ ہی جانتے تھے ۔ تبھی سے اُنھوں نے تمام عمر بغیر شادی شدہ رہنے کی ٹھان لی تھی اُن کی ماں اور بڑے بھائی نے لاکھ منایا ۔ لیکن وہ نہ مانے ۔ پشپا کی یاد اُن کے دل سے کبھی جدا نہ ہو سکی ۔

" تو ، سرکار ، " عبدل کچھ پریشان سا ہو کر بولا " تو کیا اُن کے شوہر ــــ خدا نہ کرے ــــ خدا کرے ۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ ــــ یعنی ــــ اُن کے شوہر زندہ تو ہیں ؟ "

" ہاں ، " پروفیسر صاحب بولے ، " وہ زندہ ہیں ۔ "

" تو ، سرکار کیا اُن کو چھوڑ کر ــــ اُن سے ــــ "

" نہیں ، یہ بات نہیں ، کسی کام سے آ رہی ہوں گی " اُنھوں نے کہا ۔ پھر خوش ہو کر بولے " ہمیں ملنے کے لئے لکھا ہے ۔ " اُنھیں پشپا کا تل والا گال نظر آنے لگا ۔ اُس کی لمبی

چوٹیاں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ناگن کی طرح لہرانے لگیں آنچل کا بار بار سر سے کھسکنا۔ اور بار بار اُسے ٹھیک کرنے کی وہ بیکار کوشش...... "عبدل" انھوں نے پکارا۔

"جی، سرکار۔" وہ تصویر کو گھور رہا تھا۔

"تمھیں اپنی بیوی کبھی یاد نہیں آتی؟"

"کون سی، حضور؟ پہلی یا دوسری؟"

پروفیسر صاحب مسکرائے "کوئی بھی" انھوں نے کہا۔

عبدل ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "یاد کرنے سے کیا کسی کو کوئی چیز مل جایا کرتی ہے۔ سرکار؟ پہلی تو چل ہی بسی —— رسول پاک اس کی روح کو جنت بخشے۔ اور دوسری کم بخت بھاگ کھڑی ہوئی۔ جس کسی کے پاس ہو گی۔ یقین مانئے حضور، اس کا وبالِ جان بن کر ہو گی۔ اپنے کو حور کی بچی سمجھتی تھی سالی۔"

"خیر، جانے دو،" پروفیسر صاحب ہنسی روکتے ہوئے بولے۔ "تم تو اپنے غصہ میں اپنی مالکن کو ہی بھول بیٹھے!"

"نہیں، حضور، مالکن کو کیسے بھولوں گا۔ لیکن یہ کیسی مالکن، سرکار، کہ یہ آئیں اور وہ گئیں؟ ہمیشہ کے لئے تو آپ کے پاس آ نہیں رہی ہیں۔ کوئی استمراری بندوبست کیجئے

غریب پرور۔ آپ کے کالج میں بھی تو بہت سی پڑھتی ہیں سسری۔ آپ ذرا اشارہ بھر کریں، قسم اللہ پاک کی اگر سب کی سب آپ کے قدموں پر نہ گر پڑیں۔"

پروفیسر صاحب ہنس پڑے۔ عبدل کی باتوں میں کبھی کبھی انھیں بڑا مزا آتا تھا۔ اُس کی خوشامدانہ طرز اُس کی ڈینگیں، اُس کی شیخی ——— بالکل اس کی اپنی صفت تھی۔ تبھی تو پاس پڑوس کے بنگلوں کے نوکر چاکر عبدل کو "عبدل میاں" بولتے پورن دھوبی کی بیوہ بھاوج، مونگا "بڑے میاں" کہتی اور چوک پر کا پان والا خان صاحب، کہا کرتا تھا۔

اسی وقت ٹیلیفون انھیں کباب میں ہڈی کی طرح اکھر گیا

"کون ہے، نام پوچھو" انھوں نے کہا۔

"زنانی آواز ہے سرکار۔"

"کوئی حرج نہیں، نام پوچھو۔ زنانی آواز کا کیا نام نہیں ہوتا؟"

عبدل نے نام پوچھا۔ "وہ نام نہیں بتلاتیں حضور! ہنستی ہیں،" لاچار ہو کر اس نے اطلاع دی۔

پروفیسر صاحب چائے کی خالی پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے اُٹھے اور عبدل کے ہاتھ سے انھوں نے ٹیلیفون لے لیا۔ عبدل ٹرے لے کر اندر چلا گیا۔

"ہلو ـــــ ہلو ـــــ" پروفیسر صاحب نے ٹیلیفون میں کہا۔ اور اُن کے کانوں میں ایک پہچانی سی ہنسی سنائی دی۔ "ہلو! کون ۔ پشپا! ارے، کب آگئیں تم؟"

"صبح ـــــ آج صبح،" دوسرے ہی لمحہ پشپا نے کہا۔ "تم نے تو میری آواز پہچان لی ۔ شیو!"

"بھلا میں تمھاری آواز نہ پہچانتا؟ اوہ! تم ـــ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے ... اوہ، پشپا! ..... برسوں بعد آج مجھے کسی نے "شیو" کہہ کر پکارا ہے۔"

"آٹھ برس بعد۔"

"ہاں، آٹھ برس بعد!"

"کیسے ہو، شیو؟"

"زندہ ہوں! ..... تم کہاں سے بول رہی ہو؟ اوں؟ پیراڈائز ہوٹل۔ پر تم تو شام کی گاڑی سے آنے والی تھیں نا؟"

"ہاں، مگر بعد میں ڈاکٹر نے صلاح دی کہ پہلی گاڑی سے ہی جایا جائے۔"

"ڈاکٹر؟"

"ہاں، رما کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے ۔ اُسے ایکسرے

کرانے لائی ہوں۔"

"رما کون؟" شیو نے پوچھا۔

پشپا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میرا بیٹا،" اُس نے کہا

"اوہ، تو تم ماں ہو چکی ہو!"

پشپا پھر ہنسی۔

"بولو، کب مِلتی ہو؟ جب کہو؟ میں تو تمھیں دیکھنے کے لئے مرا جا رہا ہوں۔ ابھی آؤ نا؟ ارے بھئی کالج تو مجھے گیارہ بجے جانا ہے۔۔۔ اوں؟ کیا کہا؟ شام کو؟ کیوں؟ تو کب تک لوٹ جاؤگی ہسپتال سے؟ اچھی بات ہے جیسی مرضی۔ ابھی تو رہوگی کچھ دن؟ کیا؟ بالکل ناممکن۔"

"نہیں، شیو، دیکھو نا۔ اُنھیں صرف دو ہی دن کی چھٹی ملی ہے۔۔۔ کل جانا ہی ہوگا۔"

"آئی بھی ہو تو صرف دو دن کے لئے!"

"تبھی تو ہوٹل پہنچتے ہی تمھیں فون کیا۔"

"اچھا، سنو، تو میں شام کو کب ملوں؟ تم آؤگی۔ اچھی بات ہے۔ کھانا یہیں ہوگا۔ ہاں، سب کو۔۔۔ میں انتظار۔۔۔ ہلو۔۔۔ پشپا۔۔۔"

پشپا نے ٹیلیفون بند کر دیا تھا۔ پروفیسر صاحب رسیور رکھ کر صوفے پر آ بیٹھے اور اس وقت گنگنانے لگے

فوٹو اسٹینڈ میں پشپا مسکرا رہی تھی۔ اُنھوں نے عبدل کو آواز دی۔ انھیں پورا اطمینان تھا کہ اندر جانے کا بہانہ کر، وہ دروازے کی آڑ میں کھڑا سن رہا ہوگا۔

"جی حضور،" کہتا ہوا عبدل فوراً حاضر ہوا۔

"دیکھو، رات کے کھانے کا انتظام کرو۔ تمھاری مالکن آرہی ہیں۔ کھانا اچھا بنے، سمجھے؟"

"کتنے آدمیوں کا کھانا ہے سرکار؟"

"آں؟ یہی تین، چار۔ اور سنو، بازار سے تھوڑے آم لے آنا۔"

آج پروفیسر صاحب کی طبیعت پڑھانے میں نہ لگی۔ پشپا کی کھلکھلاہٹ ان کے کانوں میں برابر گونجتی رہی۔ اس کا تل والا گال اُن کی آنکھوں کے سامنے لگاتار ناچتا رہا۔ طالب علمی کی زندگی کے پرانے پیارے دن ــــــ جن میں وہ تھے اور اُن کی پشپا تھی ــــــ انھیں پھر سے یاد آنے لگے۔ پشپا کو کھو کر انھوں نے ایک قسم کی خودکشی ہی کرلی تھی۔ زندگی بیکار ہوگئی تھی۔ ماں اور بڑے بھائی الگ دکھی تھے۔ انھوں نے کئی لڑکیاں دکھائیں اور کئی بار منت کی۔ مگر شیو کمار شادی کرنے کو کبھی راضی نہ ہوئے۔ ماں نے تو پرسوں والی چٹھی میں کسی لڑکی کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ لیکن پشپا جو دل میں گھر

کئے بیٹھی تھی یہاں تک کے پشپا سے اُن کی خط و کتابت تک نہ تھی، اُس سے انھیں کوئی خاص امید باقی نہ تھی، اُسے وہ ہمیشہ کے لئے گنواں چکے تھے، لیکن کیا اس کی دلکش صورت کو دل سے نکال پھینکنا آسان بات تھی؟ پھر، پشپا کی محبت میں اس طرح اپنی زندگی نچھاور کر دینے میں اُنھیں جو سکھ، جو طمانیت قلب ملتی تھی۔ کیا وہ کسی دوسرے سے شادی کر کے گھر بسانے میں نصیب ہو سکتی تھی؟ عبدل بھلے ہی مالکن، مالکن چلاتا رہے۔ اس کی تو عادت ہے۔ کسی کے دل کی لگی کو وہ کیا جانے ...... آہ! آٹھ سال بعد اُن کی آنکھیں آج پشپا کو دیکھیں گی! آٹھ سال! آٹھ نہ تھکنے والے پر تھک سال ......

رُومیو جولٹ پڑھاتے پڑھاتے پروفیسر صاحب کہیں اور نکل گئے تھے۔ اور بڑی دیر بعد ـــــ جب آگے والی لڑکیوں کی وہ قطار منھ دبائے ہنسنے لگی تھی ـــــ تب انھیں اپنی حالت کا خیال ہوا تھا۔ اچھا ہوا اصلی راز طالب علموں سے چھپائے رکھنے کے لئے کالج پہنچتے ہی انھوں نے درد سر کا بہانہ کر دیا تھا۔ ورنہ آج اُن کی بڑی فضیحت ہوتی۔ اُٹھ کر بار بار وہ گھڑی دیکھتے۔ پر کمبخت کانٹا بھی آج نہ جانے کیوں، بغاوت کرنے پر آمادہ ہوا جا رہا تھا۔ آخر بے چین ہو کر آخری گھنٹے میں انھوں نے کلاس کو چھٹی دے دی اور تیزی سے گھر کو روانہ ہو گئے۔

برآمدے میں پہنچتے ہی پروفیسر صاحب بھانپ گئے۔ عبدل پلاؤ بنا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں غضب کا جادو تھا۔ جب وہ کھانا بناتا سارا مکان مہک اُٹھتا۔

"حضور، ٹیلیفون آیا تھا،" نئی جاکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے عبدل نے خبر دی۔

"کِس کا؟"

"مالکن کا —— صبح والی۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" پروفیسر صاحب گھبرائے کہ کہیں ارادہ نہ بدل دیا ہو۔

"کچھ نہیں، آپ کو پوچھ رہی تھیں، سرکار۔ میں نے کہا کالج گئے ہیں، بولیں کوئی خاص بات نہیں۔ کہہ دینا ہم شام کو چھ بجے آئیں گے۔"

پروفیسر صاحب نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ "اچھا عبدل کھانے میں کتنی دیر ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ٹائم ہے حضور۔ ابھی تو ساڑھے چار بھی نہیں ہوئے میں نے پانی نکال رکھا ہے۔ آپ جائیے، نہائیے دھوئیے۔ میں سب بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آٹھ بجے ٹیبل پر آپ کو کھانا حاضر ملے گا۔ آپ فکر نہ کریں، سرکار، آج وہ کھانا کِھلاؤں گا۔ اپنی مالکن کو، حضور، کہ وہ بھی یاد کریں گی۔

اس غلام کو۔"

پروفیسر صاحب جلدی سے تیار ہو گئے۔ کمرے کی چیزوں کو عبدل نے پہلے ہی ٹھیک سنوار کر رکھ دیا تھا۔ پر پھر سے یہاں وہاں اُن میں ہیر پھیر کئے بغیر اُن کی طبیعت نہ مانی پشپا آ رہی تھی آج۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہیں ہو گی۔ شیو کے گھر میں، شیو کے ساتھ۔ اوہ، پشپا! ..... کھڑکی کے پاس کھڑے ہو نیچے سڑک پر آنے جانے والی موٹروں کو وہ دیکھنے لگے۔ کئی بار موٹریں اُن کے مکان کے پاس آکر رُکیں اور کئی بار اُن کا دل اُچھل پڑا۔ مگر پشپا اُن موٹروں میں نہ تھی۔ یکایک کمرے میں، اپنے پیچھے، کسی کے پیروں کی دن دناہٹ سُنی، شیو کمار نے پلٹ کر دیکھا۔ شوہر اور چار بچوں سے گھری ہوئی پشپا ہنس رہی تھی، ہنسی تو پشپا کی ہی تھی۔ پر وہ کتنی بدل گئی تھی! کتنی موٹا گئی تھی! اُسے تو پہچاننا بھی اب مشکل تھا اوہ! کیا یہ وہی پشپا تھی؟ ...... شیو کی آنکھوں کے آگے لال، پیلے، اور بینگنی رنگ ناچنے لگے۔ اُنھیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کا دل بند ہوا جا رہا ہے ۔ چھینٹتے ہوئے اندھیرے میں انھوں نے دیکھا، پشپا اپنے شوہر سے اُن کا تعارف کرا رہی تھی۔ "میرے پتی، اوما شنکر۔ اور یہ ہیں، شیو کمار ماتھر۔ چھٹپن میں ہم لوگ بہت جھگڑتے تھے، ہے نا شیو؟"

شیو کمار سنبھل رہے تھے۔ اوما شنکر نے اُن سے ہاتھ ملایا۔

"میرے بچّوں سے نہیں ملیں گے؟" پشپا کہہ رہی تھی یہ ہے دیا شنکر۔"

"سب سے بڑا؟" شیو کمار نے آخر زبان کھولی۔

"ہاں اور یہ سروپ رانی۔ گھر پہ ہم لوگ اسے بٹّن کہتے ہیں۔ نمستے کرو، بیٹی، چاچا سے نمستے کرو۔ یہ ہے رماشنکر ——— بڑا شریر ہے۔ دیکھو نا۔ ہڈّی توڑ کر بیٹھا ہے ادھر چڑھو گے۔ اب دیوار پر؟"

اپنے دل کی حالت پر پردہ ڈالتے ہوئے شیو کمار ایک بناوٹی ہنسی ہنسے۔ "پھر کیا کہا ڈاکٹر نے؟ ایکسرے لیا تھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں، کہتا ہے۔ ریڈلیس کا فریکچر ہے،" پشپا کے پتی نے جواب دیا "سیٹ کر کے پلاسٹر آف پیرس باندھ دیا ہے۔"

"کہتا ہے، پندرہ دن میں ہڈّی جُڑ جاوے گی،" پشپا بولی۔

"ارے، ہاں، ان کا نام تو ہمیں بتایا ہی نہیں،" پشپا کی اُنگلی تھامے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیو کمار نے پوچھا۔

"دیا شنکر۔ یہ میرا لال بڑا اچھا ہے۔"

"تو، کل جمع چار !" شیو کمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اُماشنکر صاحب کو میں بدھائی دیتا ہوں۔"

اوماشنکر اور پشپا دونوں ہنس پڑے۔ نہ جانے کیوں کر شیو کو معلوم ہوا کہ پشپا پانچویں کو بھی کہیں چھپائے ہوئے ہے۔

بچے "بے فکر ہو کر کمرے میں گھومنے پھرنے لگے۔ سب سے چھوٹا" بیچ کی میز پر سے ایسٹرے اُٹھا کر، قالین پر جا بیٹھا۔ اور اس سے کھیلنے لگا۔

دروازے کے آڑ میں کچھ آہٹ سُن کر شیو کمار نے پوچھا چائے منگاؤں؟ یا کولڈ رنک لیجئے گا؟"

"جی نہیں۔ ابھی ہم لوگ لے کر ہی چلے تھے۔ شکریہ" پشپا کے شوہر نے کہا۔

شیو کمار کو بات کرنے کا کوئی مضمون نہیں مل رہا تھا۔ اور بات کرے بھی تو کس سے؟ پشپا اب وہ پشپا نہیں رہی تھی کہ جس کے ساتھ کبھی گھنٹوں بیت جاتے تھے اور معلوم ہوتا تھا۔ پل بھی نہیں گذرا۔ آٹھ سال پہلے کے محبت کے پجاری آج کتنے انجان سے بیٹھے تھے! شیو کمار نے اُٹھ کر لائٹ جلایا اوہ! پشپا کے ہاتھ کتنے موٹے ہو گئے ہیں! ٹھوڑی پر بھی گوشت لٹک آیا ہے!

"کیا کرایہ ہے شیو، اس فلیٹ کا؟" پشپا نے پوچھا۔

"پچپن - زیادہ ہے ؟"

نہیں جی،" اوما شنکر نے کہا، "بالکل نہیں - کتنے کمرے ہیں ؟"

"دو کمرے ــــ یہ ڈرائنگ روم، ایک بیڈ روم، ورانڈا، وہ بالکنی، ایک باتھ روم اور کچن ـــــ کافی ہے ایک بیچلر کے لئے"، شیو کمار نے مسکرا کر کہا - پشپا نے آنکھیں نیچی کرلیں، مگر اس کے گالوں پر لالی نہ دوڑ سکی - وہ اب پھوٹی ہوئی ڈھولک کے مانند تھی جو تھاپ پڑنے پر بھی نہیں بجتی -

مالکن کو دیکھنے کی بڑی آرزو سے عبدل، برآمدے میں جانے کے بہانے، کمرے میں ہوتا ہوا نکلا -

لیکن شاید وہ اپنی مالکن کو نہیں دیکھ پایا - تبھی تو اس کی نگاہ پشپا پر نہ رُک کر چاروں طرف بھٹکتی رہی -

تھوڑی دیر میں وہ پھر لوٹا - پروفیسر صاحب نے دیکھا اُس کی آنکھیں اُن سے پوچھ رہی تھیں ــ "مالکن کہاں ہیں سرکار؟" وہ بس دل مسوس کر رہ گئے - نظر پھیر کر انھوں نے پوچھا.

"ریکارڈ سُنیئے گا - ؟"

سارے بچے گراموفون گھیر کر ریکارڈ پر ٹوٹ پڑنے لگے - رما، پٹی میں بندھا ہوا اپنا ٹوٹا ہاتھ لیے، دیا سے اُلجھ پڑا - بٹن گھبرا کر رو اُٹھی - وہ دیا ہنس ہنس کر اپنے چھوٹے ہاتھوں سے

تالی بجانے لگا۔ آنکھوں کے آگے "السٹریٹڈ ویکلی" ہٹاتے ہوئے اوماشنکر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"میری طرف کیا گھور رہے ہو۔ اُٹھ کر انھیں چُپ کراو نا۔"

پُشپا نے دھیمے سے شوہر کو جھڑکی دی۔ اوماشنکر اُٹھ گئے۔

گراموفون کے بعد ریڈیو بجایا گیا اِس کے بعد موسم پر چرچا چھڑا۔ موسم کے ذکر کے بعد بچّوں کی شرارتوں کا ذکر رہا اور اُس کے بعد دیش کے سیاسی حالات پر بات پہنچی۔

لاچار ہوکر، وقت سے پہلے ہی پروفیسر صاحب نے عبدل کو کھانا لگانے کا حکم دے دیا۔ عبدل غصّہ گیا۔ تین آدمیوں کا کھانا بنانے کے لئے اس سے کہا گیا تھا۔ اور یہاں تھے آدھا درجن۔ اُسے تو مالکن کا انتظار تھا۔ اور یہاں کوئی اور ہی آدھمکے، یہ سوچ کر کہ پروفیسر صاحب نے مذاق کیا ہوگا۔ آخر وہ چپ چاپ کام میں جُٹ گیا۔

ٹیبل پر بڑا شور رہا۔ شیوکمار کو کوئی چیز اچھی نہ لگی۔ پلاؤ میں خوشبو زیادہ تھی، سواد کم، سب کے درمیان بیٹھی ہوئی پُشپا ٹھیک ایسی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کہ

کوئی بڑی سی مرغی اپنے چوزوں پر پر پھیلائے ہوئے بیٹھی ہو، اوماشنکر اور شیو کمار اس کے دو بڑے چوزے تھے۔......

اُف! عورت بھی کِس بُری طرح منہ چلا کر کھاتی ہے! آٹھ سال پہلے کا وہ نازک سا پیارا تل اب لِشپا کے گال پر، مکھی کے برابر ایک دھبہ سا رہ گیا تھا۔

پروفیسر صاحب نے دیکھا۔ عبدل بار بار لِشپا کو اور اُس کی تصویر کو تک رہا ہے۔ شاید وہ ان دونوں میں کچھ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑا ہوش آیا تو اُنھوں نے تصویر پلیٹ دی۔ کہیں لِشپا کے شوہر کی نظر اس پر پہلے ہی نہ پڑ چکی ہو! انھوں نے سوچا۔ بلا سے، کنکھیوں سے دیکھا۔ اوماشنکر مسکرا رہے تھے لِشپا کھانے میں مصروف تھی۔

تھوڑی دیر بعد اپنے مہمانوں کو نیچے موٹر تک پہنچا کر جب پروفیسر صاحب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اچانک ان کا ہاتھ پتلون کی جیب میں پڑی ہوئی چٹھی پر پڑا۔ چٹھی ماں کی تھی، جس میں کسی لڑکی کے بارے میں ذکر کیا تھا۔

کمرے میں عبدل لِشپا کی تصویر اُٹھا کر ٹھیک سے

رکھ رہا تھا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے، عبدل؟" پروفیسر صاحب نے تیزی سے ٹیلیفون پر جاتے ہوئے پوچھا۔

"نو بجنے ہوا ہے" سرکار۔"

اچھا، دیکھو، ہمارا بستر تو باندھو جلدی سے اور وہ سوٹ کیس بھی بھر دو—— چمڑے والا——

"چلو جلدی کرو۔"

پروفیسر صاحب نے ٹیلیفون پر اپنے کالج کے پرنسپل سے بات کی اور تین دن کی چھٹی لے لی۔

عبدل منہ پھاڑے پروفیسر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ آج صبح سے ہی اُن کی ساری حرکتیں کچھ عجیب سی تھیں — "کیا معاملہ ہے حضور؟ یہ کہاں کی تیاری ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"گھر۔"

"کیوں، سرکار، کیوں جا رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے؟"

پروفیسر صاحب مُسکرا دیئے۔ پُشپا کی تصویر میز کی دراز میں بند کرتے ہوئے۔ انھوں نے

کہا "تمھارے لئے مالکن لانے ۔"

اُستاد کی قسم

ہندو مسلم جھگڑے کا وہ چوتھا دن تھا۔ لاٹھی، پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلوں کا دل کھول کر استعمال کیا جارہا تھا۔ سرِعام اَبلاؤں کی عِصمت لوٹی جارہی تھی۔ سر پٹاخوں کی طرح پھوٹ رہے تھے یہ اُس زمانے کا ذکر ہے۔ جب کہ شہر میں پان والوں کی دوکانوں پر سنیما ایکٹرلیسوں کے بجائے پہلوانوں کی تصویریں لٹکا کرتی تھیں اور شمبھو تنبولی کی دوکان پر ابھی تک کلّو اُستاد اور اُن کے شاگرد دینا، کی تصویریں دِکھلائی دیتی ہیں۔ کسی وقت کلّو اور دِینا کی شہرت سارے شہر میں تھی۔

لیکن اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہ لینے کی کلّو اُستاد نے اپنے اکھاڑے والوں کو سخت تاکید کردی تھی۔ بیچاروں کی رگوں میں خون اُبل رہا تھا۔ پر وہ کرتے کیا ؟ اُستاد کے حکم کی پابندی کرنی

ہی تھی۔

دینا اپنے برآمدے میں ڈنڈ پیل رہا تھا۔ پسینے سے اُس کے بدن کے پٹھے چکمک کر رہے تھے۔ اندر کے کمرے سے اوٹتے ہوئے دودھ کی عمدہ خوشبو آکر اس کے پیٹ میں بھوک کی آگ کو تیز کر رہی تھی۔ مگر پورے ہزار ڈنڈ نکالے بغیر وہ اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ دو سو ڈنڈ ابھی اور باقی تھے۔ زور سے سانس لیتے ہوئے۔ اُس نے رفتار اور تیز کر دی۔ اس کے بدن سے پسینے کی بوندیں ٹپک ٹپک کر زمین پر اس کی شبیہہ بنانے لگیں۔

دینا گنے جا رہا تھا "آٹھ سو بارہ، تیرہ، چودہ......"

اسی وقت اس کے پڑوسی 'چندو' کی بہو روتی چلاتی آئی اور لگی شور مچانے "ہائے! میں تو لٹ گئی...... آگ لگے تیری کسرت پہ بھگوان اُن کا ستیاناس کرے!" وہ دینا کی دہلیز پر دھڑام سے آکر گر ی۔

دینا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماتھے کا پسینہ اُنگلیوں سے جھٹک کر اُس کے پاس آیا۔ دیکھا، وہ خون میں لت پت تھی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا، گنگا بھابھی؟"

دینا کی استری اوٹائے ہوئے دودھ کا لوٹا لئے باہر آئی۔ گنگا کی حالت دیکھ کر وہ بھی سہم گئی، گنگا کراہ رہی تھی۔

"ارے کیا بات ہے، بولے گی بھی! کس نے مارا؟"

"بجلی گرے چنڈالوں پر" گنگا نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا' "عورت پر ہاتھ اُٹھاتے شرم نہیں آئی !"

دینا کی استری نے سمجھ لیا کہ معاملہ کیا ہے ۔ اُس نے اپنے پتی سے کہا " جان پڑتا ہے ، مسلمانوں نے مارا ہے ۔"

" کہاں چوٹ آئی ہے ، دیکھیں تو ؟" دینا نے گنگا کو ہلا کر کہا ۔ " کاہے کو نکلی تھی مرنے کے لئے باہر ؟ معلوم نہیں ، دنگا ہو رہا ہے ؟"

گنگا پھپھکار کر اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ " چوڑی پہن لے ، چوڑی! گھر میں گھُس کر باتیں بناتے لاج نہیں آتی ؟"

" ارے ، بتائے گی بھی کہ کہاں لگی ہے ، یا بک بک ہی کرتی جائیگی؟"

" دیکھ ، یہ دیکھ ،" کہہ کر گنگا نے آنچل ہٹا کر اپنی چھاتی دکھلا دی ۔ اس کا ایک پستان چیر دیا گیا تھا ۔ " دیکھ لیا اپنی پھوٹی آنکھوں سے ؟ جا ، چھپ جا اب اپنی جورو کے لہنگے میں ۔"

گنگا کھڑی نہ رہ سکی تکلیف اور شرم سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی ، کھمبے کو تھام کر وہیں بیٹھنے لگی ، مگر بے ہوش ہو کر گر پڑی ۔

دینا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔ ایک آبلہ نے آج اس کی طاقت کو دھتکارا تھا ۔ اس کے بازو پھڑک اُٹھے ۔ آندھی کی طرح اندر لپک کر اس نے کونے میں رکھی ہوئی لاٹھی اُٹھالی ۔

" یہ کیا کرتے ہو ؟" دینا کو روک کر اس کی استری نے کہا ۔

"ہٹ جا میرے سامنے سے" دینا نے جھٹکا دے کر اپنے کو استری سے چھڑا لیا۔ دودھ کا لوٹا گڑ گڑاتا ہوا سڑک پر جا پہنچا۔

"مجھے قسم ہے اپنے استاد کی اگر میں نے آج کسی بھی مسلمان کو اس راستے سے زندہ جانے دیا۔ ڈھیر لگا دوں گا اُن کی لاشوں کا اس سڑک پر۔"

لاٹھی سن سناتا ہوا دوسرے ہی لمحہ وہ سڑک پر جا پہنچا۔ مسلمانوں کے دِل کانپ اُٹھے۔ اس راہ سے گذرنے کی اُن کی ہمت نہ ہوئی۔

* * *

اُدھر کلو اُستاد جو مالش کر کے اُٹھے، تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک چھوٹے سے ہندو بالک کو مسلمانوں نے گھیر لیا ہے۔ ان کے اکلوتے بچّہ کو مَرے ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس بالک کو مشکل میں دیکھ، اُن کے پدرانہ الفت پر کاری ضرب لگی، ان کی آدمیت تلملا اُٹھی۔ وہ دوڑ کر بھیڑ میں جا پہنچے اور اس ہندو بچّے کو چھُڑا، مسلمانوں کو للکار کر بولے۔ "شرم نہیں آتی تم لوگوں کو! ایک چھوٹے سے بے قصور بچہ پر مردانگی دکھا رہے ہو!"

"استاد!" ایک مسلمان بھیڑ سے آگے بڑھ کر بچہ کو اُن سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "تم بیچ میں نہ پڑنا۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا

کلو اُستاد نے اُسے ایک گھونسہ رسید کیا۔ وہ دور جا گِرا۔ لاٹھیاں اُٹھنے لگیں۔ مگر جٹ ایک کی لاٹھی چھین کر، کلو استاد نے پینترا بدلا اور بھیڑ کو مخاطب کر کے سنجیدگی سے کہا۔ "ہٹ جاؤ تم لوگ میرے سامنے سے

سچ کہتا ہوں، لاشیں گرا دوں گا۔ مجھے قسم ہے اپنے استاد کی اگر میں نے اس بچّہ کو اس کے گھر صحیح سلامت نہ پہنچا دیا۔"

لوگوں کو معلوم تھا کلو اُستاد بات کے پکے ہیں، اُنھوں نے اُستاد کی قسم کھائی تھی۔ اُن سے مقابلہ کرنے کی کسی کی تاب نہ ہوئی اُن کا لاٹھی تولنا ہی تھا کہ راستہ صاف ہو گیا۔

کلّو اُستاد ایک ہاتھ سے لڑکے کو پکڑے اور دوسرے میں لاٹھی تھامے (ہنومان گلی) میں بڑھ چلے۔ مسلمانوں کی ٹولی، تماش بینوں کی محفل، اُن کے ہمراہ ہو لی، کیوں کہ لوگ جانتے تھے کہ اس ہنومان گلی میں دینا راستہ روکے کھڑا تھا۔ ہندوؤں نے جب دیکھا کہ کلو استاد اپنے ساتھ ایک ہندو بالک کو بچا کر لئے آرہے ہیں، تو اُنھوں نے تالیوں کی بوچھار کر دی۔

پر اپنے گھر کے آگے دینا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ دور ہی سے بولا: "بس، اُستاد، رُک جانا وہیں پر۔"

کلو اُستاد کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا وہ بڑھتے ہی گئے۔

"استاد، میں پھر کہے دیتا ہوں، اس راستہ نہ آنا آج ... استاد ـــــ استاد ـــــ"

"یہ ناممکن ہے، دینا!" کلو اُستاد مُسکرا کر بولے۔ "آج میں نے اپنے اُستاد کی قسم کھائی ہے کہ اس بچّہ کو اپنے ہمراہ اس کے گھر تک پہنچا دوں گا ـــــ مجھے جانا ہو گا۔"

"اگر یہی بات ہے اُستاد" دینا نے مِنت کی، "تو اُسے میں پہنچا دیتا ہوں، پر آپ اس راستہ نہ جائیں۔"

"میں اپنا قول واپس نہیں لے سکتا،" کلو اُستاد سخت آواز میں بولے، "میں نے اپنے استاد کی قسم کھائی ہے۔"

دینا تن گیا۔ "مگر میں نے بھی اپنے اُستاد کی قسم کھائی ہے۔ اس راہ آج کوئی مسلمان نہیں گزر سکتا۔"

کلو استاد کو تعجب ہوا۔ "جس اُستاد کی قسم کھائی ہے۔ وہ بھی نہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

کلو اُستاد تھوڑا سا مسکرائے اور بچے کو بازو کر، لاٹھی سنبھالتے ہوئے بولے: "شاباش، بیٹا، شاگرد ہو تو ایسا ہو، چل، آجا — تو اپنا فرض ادا کر اور میں اپنا فرض ادا کروں۔" کلو استاد لاٹھی تان کر آگے بڑھے

"اُستاد — اُستاد — اُستا! مان جاؤ، اُستاد!" چلاتا ہوا دینا پیچھے کھسکتا اُن سے آگے نہ بڑھنے کی مِنت کرتا رہا، پر کلو اُستاد نہ مانے۔ آخر لاچار ہو کر دینا رُک گیا اور اُس کی لاٹھی جوش میں اُٹھی۔ کلو اُستاد کی لاٹھی بھی سن سنانے لگی۔ دونوں پہلوان دو بادلوں کی طرح اُٹھے اور ایک دوسرے سے جا ٹکرائے۔

ان اُستاد۔ شاگرد کی آپس میں کھٹک جانے کی خبر ذرا دیر میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ تماشائیوں کے روپ میں (ہنومان گلی) کے اندر

ہندو مسلمان کا خاصہ ہجوم اُمنڈ آیا۔

دونوں کی لاٹھیاں کھٹا کھٹ اور دھیا دھب بج رہی تھیں۔

دونوں کے جسم میں بجلی کی طرح پھرتی سما گئی تھی۔ سڑک بُری طرح چھلی جا رہی تھی۔ خون کی دھاریں دونوں کے بدن سے رواں تھیں۔

پورے آدھ گھنٹے کی گھمسان لڑائی کے بعد دونوں بُری طرح گھائل ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے لوگوں کی بھیڑ ذرا پاس کھسک آئی، مگر زیادہ آگے بڑھنے کی اُن کی ہمت نہ ہوئی۔ دینا ساری طاقت لگا کر ہاتھوں کے بَل اُٹھتا اور گھسٹتا، رینگتا، کلو استاد کے نیم جان جسم کے پاس پہنچا۔ اور اپنا سر اُن کے پیروں پر رکھ کر بولا: "اُستاد ـــــ مجھے معاف کر دینا ..."

کلو اُستاد بھی طاقت لگا کر اُٹھ بیٹھے اور دینا کو گلے لپٹا کر بولے: "شاباش، بیٹا! مجھے تم پر ناز ہے۔"

دینا کی آنکھیں مُند گئیں، دوسرے لمحہ کلو اُستاد بھی ڈھلک پڑے۔ بھیڑ رو رہی تھی۔ آخر کار اُن لپٹی ہوئی لاشوں کو جُدا کیا گیا۔ ہندوؤں نے دینا کی لاش سنبھالی اور مسلمانوں نے کلو استاد کی، لاشوں پر بے تحاشہ پھول برسائے گئے۔ پھر انگریزی باجے کے

ساتھ بڑی دھوم دھام سے، "ہندو مسلمانوں" نے ایک ساتھ مل کر (ہنومان گلی) سے کلو اُستاد کا جنازہ اور دینا کی آرتھی نکالی۔

اُس دن سے شہر میں پھر کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا ––

گھونسلہ

روشن دان میں پڑے ہوئے چڑیا کے گھونسلے سے اگر پر پھڑپھڑانے کی آواز شیلا کو اپنی طرف مخاطب نہ کرتی، تو نہ جانے کب تک وہ اپنی خوش خیالیوں میں غوطے لگاتی رہتی.... اُس نے اُس گھونسلے کو بنتے دیکھا تھا۔ اُسے یاد ہے، ایک ایک تنکا لا لاکر دونوں چڑیوں نے چھوٹا سا وہ گھونسلا تیار کیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے مادہ باہر نہیں نکلی۔ شیلا نے سوچا، 'شاید اس میں انڈے بھی پڑے ہوں!' اِس سوچ نے اُس کے دل میں عجیب گدگدی پیدا کی۔ دھیرے سے گردن گھما کر اس نے پلنگ پر پاس ہی لیٹے ہوئے گوکل کی طرف دیکھا۔ وہ بے فکر سو رہا تھا۔ وہ ذرا پاس کھسک آئی، اور ہتھیلی کے سہارے اپنا سر اُٹھائے ایک ٹک اس کو دیکھنے لگی۔ گوکل ذرا مُسکرایا۔ پھر اُسے اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا۔

"ابھی تک جاگ رہی ہو!"

جواب میں شیلا نے اس کی چھاتی میں اپنا منھ چھپا لیا۔ گوکل اس کے سر کو تھپتھپانے لگا۔

"نیند نہیں آ رہی ہے آج؟"

"اوہوں" اسی طرح منھ چھپائے ہوئے شیلا نے جواب دیا

"کیوں؟"

شیلا کچھ نہ بولی۔ شبستان کی اُس خاموشی میں گوکل اور شیلا چپ چاپ پڑے لہروں کی میٹھی دھن سننے لگے۔ شیلا کی اس حرکت میں گوکل نے کچھ تعجب کا رنگ دیکھا۔ آج کل وہ کچھ کھنچی سی رہتی تھی۔ اُس کی چنچلاہٹ، اس کا کھلکھلا کر ہنس پڑنا کافور ہوا جا رہا تھا۔ اس میں سنجیدگی کے آثار پائے جاتے تھے مگر اُس کی کسی بھی بات میں گوکل کو بے رُخی نہیں دکھلائی دی، بلکہ اُسے معلوم ہوا، اس کی شیلا ان دنوں پہلے سے زیادہ سکھی ہے....

'پھر یہ آنکھ مچولی کیوں؟' اس نے سوچا 'ضرور کوئی بات ہے' جو شیلا مجھ سے چھپائے ہوئے ہے'

اِسی وقت ملبار ہل کے گھنٹہ گھر کی گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے شیلا نے سر اوپر اُٹھایا۔ چاندنی کی روشنی میں اس نے دیکھا گوکل آنکھ بند کئے پڑا تھا۔

"سو گئے کیا؟"

"نہیں تو۔"

گوکل نے آنکھیں کھول دیں "کیا بات ہے ؟"

"کچھ نہیں، یوں ہی پوچھا۔"

"شیلا ——"

شیلا نے ساری طاقت جمع کر کے گوکل کی طرف دیکھا

"تم مجھ سے ناراض ہو ؟"

"میں ؟"

"ہاں ؟"

"کیوں بھلا ؟"

"کیا معلوم۔ آج کل میں نے دیکھا ہے، تم کچھ الگ الگ سی رہتی ہو۔"

شیلا مسکرائی۔ ٹپ ٹپ کرتی اس کی آنکھیں نیچے کو جھکیں اور پھر اٹھ گئیں۔ اس نے اپنی باہنہ گوکل کے گلے میں سرکا دی، اور ایک اطمینان بھری سانس چھوڑ کر دھیمے سے کہا:

"میں بہت سکھی ہوں۔"

گوکل نے اُسے چوم کر دھیرے سے چادر اوپر کھینچ لی۔

صبح جب گوکل کی آنکھ کھلی، دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لو ٹائیڈ ہونے کی وجہ سے سمندر کنارے سے دور ہٹ چکا تھا اور اس کی لہروں کی دھن بہت آہستہ ہو گئی تھی۔ پلنگ پر کچھ تنکے

پڑے ہوئے تھے، جنھیں چن کر وہ باہر پھینکنے لگا۔ شیلا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی بال سنوار رہی تھی۔

"آج بڑی دیر تک سوئے!" شیلا نے آئینے میں گوکل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گوکل نے جماہی لی۔

"کیا بجا ہے؟"

"آٹھ بجنے کو ہیں...... پتاجی پوچھ رہے تھے تمھیں میں نے کہا ابھی سوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، دوکان پر جلدی جانا ہے۔"

"ارے ہاں"

گوکل ہڑبڑا کر بستر سے الگ ہو گیا۔ "گوالیار مہاراجہ کا آدمی آنے والا ہے۔ آج دوکان پر نو بجے۔ اُنھیں کچھ جواہرات چاہییے"

یہ کہتا ہوا گوکل باز و کے کمرے میں جھپٹا۔

شیلا نے گھنٹی بجائی۔ بڈھا نوکر فوراً حاضر ہوا۔

"برجو، جا جلدی چائے لے آ، اور شوفر سے کہنا کہ موٹر نکالے اور دیکھ، بڑے سرکار سے کہہ دے کہ سرکار تیّار ہو رہے ہیں۔"

برجو چلا گیا۔ شیلا نے کباٹ سے گوکل کے کپڑے نکالے اور قمیص میں بٹن لگانے لگی۔

تھوڑی دیر میں نہا دھو کر گوکل آگیا اور کپڑے پہننے لگا۔ برجو چائے کا ٹرے لاکر رکھ گیا۔ جلدی جلدی گوکل نے چائے پی اور رِسٹ واچ میں وقت دیکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا، شیلا، میں جاتا ہوں۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

"یہ ٹوسٹ تو کھالو۔"

"نہیں، بس اب رہنے دو۔"

مگر شیلا کب ماننے لگی، اس نے ٹوسٹ گوکل کے منھ میں دے ہی دیا۔ گوکل نے شیلا کے گال پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر ہو گیا۔

شیلا نے کھڑکی سے دیکھا، نیچے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ گوکل کا اس میں بیٹھنا ہی تھا کہ 'سون' کرتی ہوئی دالان سے باہر ہو گئی۔ مَلبار ہِل کی ٹیڑھی میڑھی سڑک پر سے نیچے کو جاتی ہوئی موٹر بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ نگاہ سے موٹر اوجھل بھی ہو چکی، لیکن شیلا کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی ایک ٹک ادھر دیکھتی ہی رہی، ابھی تک ان کو پتہ نہیں ہے، اس نے سوچا اور دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔ پھر اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا کہ اس نے گوکل کو —— 'اپنے گوکل کو'، ابھی تک اپنے حسین خوابوں سے بے خبر رکھا، یہ اچھا نہیں کیا۔ مگر اس برتاؤ میں شیلا نے ایک عجیب خوشی محسوس کی، اس کے سارے جسم میں جھنجھنی پیدا

ہونے لگی، مسکراتی ہوئی وہ پلنگ پر آلیٹی۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ گھونسلے سے کچھ تنکے اُڑے اور شیلا کے آس پاس پلنگ پر پھیل گئے۔

دوکان سے لوٹ کر گوکل نے دیکھا، شیلا پلنگ پر بیٹھی ہوئی کچھ بُن رہی تھی۔ گوکل نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک دم اُس کی سمجھ میں نہ آیا، اور جب آیا، تو اس پر اُسے یقین نہیں ہوا شیلا کی گود میں لال اون کا گولا پڑا ہوا تھا۔ اور وہ دھیرے دھیرے سلائیوں پر ایک ننھا سا موزہ بُنا رہی تھی۔

"شیلا!" مارے خوشی کے گوکل چلّا اُٹھا۔

شیلا چونک پڑی۔ اس نے دیکھا، پیچھے گوکل کھڑا تھا وہ شرما کر موزہ چھپانے لگی۔ لیکن گوکل نے جھپٹ کر موزہ اس سے چھین لیا۔ شیلا سے کچھ نہ بن سکا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ گوکل خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے شیلا کو اُٹھا لیا۔ اور زور سے گول گھما کر بستر پر واپس لا رکھا شیلا کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور پیار بھری نگاہ سے اُسے تکنے لگا۔ شیلا شرم، اور خوشی کی زیادتی سے سُکڑی جا رہی تھی۔ گوکل نے اُسے باہوں میں لے کر کہا۔

"شیلا!"

شیلا نے دھیرے دھیرے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے۔
"تین سال بعد،" گوکل نے کہا، "آج تمھاری گود بھری ہے! ۔ ...... اپنی شادی کو تین سال ہوتے آئے نا؟"

اُس نے سر ہلا کر 'ہاں' جتایا، پھر بولی:
"جاؤ، تم کپڑے اُتارو، پتاجی کھانے کے لئے راہ دیکھتے ہوں گے؟"

پلنگ پر بکھرے ہوئے تنکوں کو گوکل چُننے لگا۔
"تم جانتی ہو، میں آج کتنا خوش ہوں؟"
شیلا نے روشن دان میں پڑے ہوئے گھونسلے کی طرف اِشارہ کیا۔

"اس میں بھی ہم جیسے دو سکھی جیو رہتے ہیں!"
گوکل نے اِدھر نظر پھرائی۔ مادہ گھونسلے میں بیٹھی ہوئی نر کے لَوٹنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ شیلا نے دونوں موزے بن ڈالے۔ اور اکثر جب گوکل دوکان چلا جاتا، وہ اُن کو چھاتی سے لگائے گھنٹوں پڑی رہتی۔

گوکل بھی ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے، میز کی دراز کھول کر اس میں رکھے ہوئے لال اُون کے اُن ننھے سے موزوں کو دیکھ لیا کرتا۔
بستر پر پڑے پڑے دونوں رات کو بڑی دیر تک، آنے والے

نئے مہمان کی نسبت سوچا کرتے۔ ایک رات ایسے ہی تھوڑی دیر چپ چاپ پڑے رہنے کے بعد اچانک گوکل پوچھ بیٹھا۔

"کیوں، شیلا، 'رمیش'، نام کیسا ہوگا؟"

"کس کے لئے؟" انجان سی شیلا بولی۔

"تمھارے لئے!"

"شیلا مسکرائی۔"

"بولو نا؟"

"نا، یہ تو بڑا معمولی سا ہے۔"

تھوڑی دیر سوچ کر گوکل نے سمجھایا۔

"سودھیر، پسند ہے؟"

"...... اوہوں ...... کوئی اور سوچو۔

"'ونود'؟"

شیلا ہنس پڑی

"تمھیں تو جان پڑتا ہے۔ پورا بھروسہ ہے کہ لڑکا ہی ہوگا؟"

گوکل بھی ہنس پڑا، بولا:

"ارے! یہ تو مجھے سوجھا ہی نہیں!"

گوکل کے بالوں میں شیلا انگلیاں چلاتی ہوئی بولی:

"اگر لڑکی ہوئی، تو اس کا نام 'نینا' رکھیں گے — تمھیں پسند ہے؟ — 'نینا'؟"

"بڑا اچھا ہے۔ اور اگر لڑکا ہوا تو؟"

"تو (دینود)۔"

"لیکن یہ طے ہے کہ تمھارے نام کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ دینود بابو آرہے ہیں ——"

گھونسلے میں چڑیا نے پر پھڑپھڑائے۔

"لو،" گوکل بول اُٹھا، "چڑیا بھی یہی کہہ رہی ہے۔"

مُسکرا کر شیلا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس طرف اٹھا دیں۔

جلد ہی یہ خوش خبری کوٹھی میں سب کو مل گئی۔ انعام اکرام بٹنے لگے۔ بڑے سرکار نے لنگر کھول دیا۔ بڑی مالکن نے دان خیرات دینا شروع کر دی۔ مندر میں پوجا پاٹ چڑھنے لگا۔ ....

اس دن پلنگ پر لیٹا ہوا گوکل پاٹ پڑھ رہا تھا رہ رہ کر اوپر سے گھونسلے کے تنکے اس پر آگرتے تھے۔ وہ انھیں جھٹک کر الگ کرتا جاتا تھا۔ بار بار اس طرح ستائے جانے پر وہ جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ تنکوں نے کئی دنوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے گھونسلے کو روشن دان کے دوسرے سرے پر سرکا دینا مناسب سمجھ، کھونٹی سے لٹکی ہوئی چھڑی اُٹھائی۔ اور پلنگ پر چڑھ کر اُسی سے گھونسلا دھیرے دھیرے ہٹانے لگا۔ تبھی شیلا، گلدستے کے پھول لئے اندر آئی۔

"ہاں! ہاں! یہ کیا کرتے ہو!" وہ چھوٹتے ہی بولی

چڑیا پھُر سے اُڑکر روشن داں کی پٹری پر جا بیٹھی - اچانک گھونسلہ ترچھا ہو کر ڈھلک گیا، اور پٹ، پٹ، پٹ، اس میں سے تین انڈے زمین پر گر کر پھوٹ گئے، شیلا چیخ اُٹھی -

"ہائے !..... یہ تم نے کیا کیا !"

گوکل سہم گیا - دونوں چڑیوں نے 'چوں چوں' مچادی، شیلا سے کھڑے نہ رہا گیا - وہ کرسی کا سہارا لے آگے بڑھی اور پلنگ پر بیٹھ گئی -

"میری منشا انڈوں کو نقصان پہنچانے کی ہرگز نہ تھی... میں تو صرف گھونسلے کو ذرا سرکا رہا تھا - تاکہ تنکے پلنگ پر نہ گریں ......"

شیلا پھوٹے ہوئے انڈوں کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی تھی انڈوں میں سے پیلا سفید پانی فرش پر بہہ نکلا تھا - یہ تین جان کی لاش تھی -چڑیوں کے حسین خوابوں کا انجام تھا ... شیلا کی آنکھیں چھل چھلا اُٹھیں ......"

گوکل کا بُرا حال تھا، وہ شیلا کے پاس بیٹھ گیا - اور اس کے کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے ہلاتا ہوا بولا،

"شیلا —— مجھے معاف کرو —— میں —— مجھے بہت

افسوس ہے ـــــ شیلا! ـــــ"

شیلا نے گوکل کی طرف دیکھا۔ گوکل کی آنکھیں درد ولپشیمانی سے حرکت کر رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتی ہوئی بولی۔

"اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں .... دل خراب نہ کرو"

حالانکہ شیلا نے اپنی طرف سے اس طرح دلاسا دیا، گوکل جانتا تھا کہ شیلا نے اپنے دِل میں اُسے قصوروار ہی ٹھہرایا تھا۔ اور اُسے وہ کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔

چڑیوں نے گھونسلہ چھوڑ دیا۔ رات کو اب روشن دان سے پَر پھڑپھڑانے کی آواز نہیں آیا کرتی۔ اُس اُجڑے ہوئے گھونسلے کے تنکے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک ایک کر کے کئی دنوں تک پلنگ پر گرتے رہے۔ لیکن گوکل کی کبھی بھی ہمت نہ ہوئی کہ اُنھیں اُٹھا کر دور کرے۔ جلد ہی روشن دان سے گھونسلے کا نام ونشان مٹ گیا .... شیلا کو کبھی آسانی سے نیند نہیں آئی۔ پلنگ پر پڑی پڑی وہ روشن دان کو دیکھا کرتی۔ اور چپکے چپکے آہیں بھرتی، مگر چڑھتے ہوئے سمندر کی آواز میں اُس کی آہیں دب جائیں۔

اُس دن غسل خانے کے چکنے پتھر پر شیلا کا پیر پھسل گیا چوٹ تو اُسے زیادہ نہ آئی، مگر نتیجہ اس کا وہی ہوا، جس سے

کوٹھی میں کئی دل کانپ اُٹھے ۔ بڑے سرکار نے بمبئی کے بہترین ڈاکٹر کو طلب کیا ۔ بڑی مالکن نے منّت مانی ..... لیکن سب بیکار رہا ۔ شیلا کی ساری آشاؤں پر پانی پھر گیا ۔ گوکل کے دل میں بھی چوٹ گہری لگی ۔

سوتے، جاگتے کئی بار دیکھے ہوئے میٹھے خواب شیلا کے دل میں ایک درد بن کر رہ گئے .... وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میز کی دراز کھولتی اور لال اُون کے اُن ننھے سے موزوں کو اُٹھا کر اپنی چھاتی سے چمٹا لیا کرتی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ....

گوکل، ہزار بہانے، شیلا کو بھلائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ دراز سے موزے نکال کر اُس نے کہیں اور چھپا دیئے مگر شیلا کے ایک ماں والے دل میں جمی ہوئی پہچانی سی وہ ننھی تصویر نہ مٹ سکی ۔ شیلا کی آنکھوں میں گوکل جب کبھی بھی دیکھتا اُن میں ایک چھپا ہوا الزام پاتا ۔ اور وہ بے چین ہو اُٹھتا شیلا نے اس کے دل کو راحت پہنچانے کی کافی کوشش کی اور بہتیرا کہا کہ گھونسلے والے حادثے کو وہ کب کی بھول چکی، مگر گوکل کے پشیمان دِل کو کبھی تسلّی نہ ہوئی، اور اُس کی یہ دلی کشمکش ہی غلط اندازی کی دیوار بن کر دونوں کے درمیان کھڑی ہو گی ۔

مہینوں بیت گئے ۔ اور ایک دن شبستان والے ۔ اُسی

روشن دان کی پٹری پر منھ میں تنکا لئے چڑیا پھر سے بیٹھی۔ گھونسلے کی نیو پڑ رہی تھی۔ گوکل کا دل اُچھل پڑا۔

"شیلا!" وہ بہت خوش ہو کر بولا، "تم نے دیکھا، چڑیا پھر سے گھونسلہ بنا رہی ہے۔!"

شیلا پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اُس نے مُسکرا کر نگاہ روشن دان کی طرف پھرائی۔ اُمیدوں کے جھولے میں دونوں جھولنے لگے۔

گھونسلہ کچھ ہی دنوں میں بن کر تیار ہو گیا! ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پھر تنکے اُڑ اُڑ کر پلنگ پر آ گرنے لگے...... اور گوکل اور شیلا کے درمیان بنی ہوئی خیالی دیوار یکا یک ٹوٹ کر گرنے لگی۔

ایک رات گوکل اور شیلا جب سونے گئے، آسمان میں بادل منڈلا رہے تھے۔ چاند کی پتلی سی لکیر گہرے اندھیرے میں ایک دم کھو گئی تھی۔ اُمنڈتے ہوئے سمندر کی بڑی بڑی لہریں ملبار ہل کے کنارے سے ٹکرا کر بھیانک آواز پیدا کر رہی تھیں۔ مچھیرے اپنی اپنی کشتیوں کو کنارے سے لگا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بڑے زوروں سے بارش ہونے والی ہے۔

آدھی رات کے قریب شبستان کی کھڑکیاں آندھی سے کھڑکھڑا اُٹھیں۔ اور پانی کی بوچھار اندر داخل ہوئی۔ گوکل اور شیلا جاگ کر اُٹھ بیٹھے۔ اُنھوں نے دیکھا، باہر زبردست آندھی کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی، پیڑ پودے

اُکھڑ کر گر رہے تھے، جدھر اُدھر جل تھل ہوا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکیاں بند کیں۔ مگر پھر بھی سمندر کی خوفناک پھُپھکار اندر سنائی دے رہی تھی۔ کرر کرر، کرتی ہوئی آندھی نے روشن دان کا ایک کانچ توڑ کر گرا دیا۔ کانچ کا ”دھن“ سے نیچے گرنا تھا کہ شیلا کانپ اُٹھی —

”ہائے رام! . . . . وہ گھونسلہ!“ اُس کے منھ سے چیخ نکلی، ٹوٹے ہوئے کانچ سے گھُستی ہوئی ہوا میں گھونسلہ ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔

گوکل لپک کر پلنگ پر چڑھا۔ اور وہاں سے دیوار سے لگی ہوئی الماری پر جا پہنچا۔ دونوں چڑیاں پھدک کر گھونسلے سے دور ہو گئیں۔ اور ”چوں چوں“ کر کے انھوں نے ہائے توبہ مچا دی۔ ٹوٹے ہوئے کانچ سے آتی ہوئی پھوہار گوکل کے منھ پر پڑنے لگی شیلا نے جلدی سے اُسے اپنی ایک ساڑی پکڑا دی اور خود ہلتی ہوئی الماری کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ گوکل نے ساڑی روشن دان میں ٹھونس دی۔ ہوا ایک دم رُک گئی۔ گھونسلہ ٹھہر گیا اور بجلی کی چکا چوندھ میں اس کے اندر سے تین انڈے چمک اُٹھے۔ اپنی دھوتی کے ایک کنارے سے گوکل نے گھونسلے کا پانی پوچھنا چاہا۔ مگر دونوں چڑیاں انڈوں پر وار ہوتا جان کر اس کے ہاتھ میں چوٹ کرنے لگیں۔ وہ مسکراتا ہوا اُتر آیا۔

"انڈے ہیں؟" شیلا نے پوچھا۔

"تین۔"

شیلا نے دیکھا، بھیگے ہوئے کپڑوں میں گوکل کانپ رہا تھا۔

"تم جلدی کپڑے بدلو،" اس نے التجا بھری آواز میں کہا۔"

"بڑی ٹھنڈ ہے، کہیں سردی نہ لگ جائے۔" وہ فوراً کباٹ کھول کر دوسرے کپڑے نکال لائی" لو، جلدی سے پہن لو۔"

تھوڑی دیر میں دونوں چڑیاں گھونسلے میں پھر سے جا بیٹھیں، اطمینان کا ایک سانس لے کر گوکل پلنگ پر آلیٹا۔ آندھی تھم رہی تھی۔ پانی بند ہو رہا تھا شیلا نے گوکل کو رضائی اُڑھا دی۔ اور بازو میں بیٹھتی ہوئی اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی۔ گوکل نے اُسے رزائی کے اندر لے لیا کچھ دیر بعد شیلا نے دھیرے سے کہا:

"وہ موزے کہاں ہیں؟"

حیرت اور خوشی سے گوکل ششدر رہ گیا۔ کہنی کے بل کچھ اُٹھ کر اس نے پوچھا:

"سچ ؟"

. . . . اور شیلا کی شوخ آنکھیں مُسکرا کر مُند
گئیں۔

لال کوٹھی

جب ہم لوگ میوزیم شیوباڑی اور جوناگڈھ دیکھ کر لوٹے تو چھ بج رہے تھے۔

"بھئی، کھانا تیار ہے، منگوایا جائے؟" دوارکا نے پوچھا۔"

"یار،" میں نے کہا "ابھی تو بھوک ذرا بھی نہیں ہے۔"

"بغیر کھائے تو تم جا نہیں سکتے۔"

"تو ساتھ بندھوا دینا۔"

"اچھا، مگر چائے، لسّی کچھ تو، ——" "لسّی چاہئے منگوا لو۔" دوارکا لسّی منگوانے نیچے چلا گیا۔

سامان تو میرا بندھ کر تیار ہی تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگا۔ آسمان میں کچھ پتنگیں تنی ہوئی تھیں۔

جس چھت کے کنارے والے ایک کمرے میں میرے رہنے کا بندوبست کیا گیا تھا وہ دوارکا کی اُس کوٹھی کے چوتھے منزل پر تھی۔ یہاں سے سارا شہر بخوبی دکھلائی دیتا تھا۔ مارواڑ کے شہروں کی ڈھب ہی نرالی ہوتی ہے۔ مکان اکثر چھجے دار، اور اونچے اور پتھر کے بنے ہوتے ہیں، جن پر کمال کی نقاشی ہوتی ہے۔ سو کر اُٹھنے کے بعد اسی چھت پر نکل کر ہر روز میں بڑی دیر تک ٹہلا کرتا تھا، اور راجپوتی ٹھاٹھ پر بنے ہوئے اُن بے شمار مکانوں کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پٹ ایک کے بعد ایک کھُلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اُن پانچ چھ دنوں میں ہی اپنی اس چھت کے چاروں طرف ہر مکان، ہر کھڑکی اور ہر چھت سے میں اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں، دل میں رہتے رہتے درد بھی دل ہو جاتا ہے۔ آج بیکانیر چھوڑتے ہوئے مجھے دُکھ ہو رہا تھا۔ بیکانیر ہی اکیلا نہیں چھوٹ رہا تھا، دوارکا چھوٹ رہا تھا۔ میرا وہ کمرا چھوٹ رہا تھا، اُس کمرے کی دیواروں پر پُرانے کسی مصوّر کے بنائی ہوئی خوبصورت تصویریں چھوٹ رہی تھیں، جن کو میری آنکھیں ہر روز سونے سے پہلے گھنٹوں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھورا کرتی تھیں، کبوتر کا وہ جوڑا چھوٹ رہا تھا۔ جو میرے کمرے کی ایک جالی دار کھڑکی میں بسیرا لیا کرتا تھا، وہ اونٹ بھی چھوٹ رہے تھے جو صبح شام پیٹھ پر پانی کی پکھال لادے میری کھڑکی کے

پاس والی گلی سے گزرا کرتے تھے ......"

چٹ چٹ سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوارکا میرے پاس آیا "دیکھنا، پتنگ اپنی ہی چھت پر گرنے والی ہے۔ دیکھو، ہوا ادھر کی ہی ہے۔"

"کون سی پتنگ کٹے گی، بولو" میں نے بڑی گرم جوشی سے پوچھا، پتنگ کی لڑائی میں مجھے بھی مزہ آرہا تھا۔ کئی لوگ اپنی اپنی چھتوں پر نکل کر تماشا دیکھ رہے تھے۔

"ہری والی پتنگ کے آثار ٹھیک نہیں، دیکھا، چکر کھانے لگی ...... کٹتی ہی ہے اب ــــ"

دوسرے لمحے ہری پتنگ پار تھی۔ چکرائی، منڈلاتی وہ ہمارے ہی چھت کی طرف آنے لگی، آس پاس کی تنگ گلیوں میں لڑکے بانس، لکڑیاں لے لے کر پتنگ پکڑنے اور مانجھا لوٹنے کے لئے دوڑنے لگے، ایک شور برپا ہو گیا۔

دوارکا لپکا، مگر ڈورا اس کے ہاتھ نہ لگا۔ پتنگ ذرا بچ کر بازو والے لال پتھر کے مکان کی چھت پر جا گری۔

"لال کوٹھی!" دوارکا بول اٹھا۔ "پتنگیں تو بس "لال کوٹھی" پر قربان ہیں۔ جتنی بھی کٹتی ہیں "لال کوٹھی" پر ہی گرتی ہیں دیکھا نا لونڈوں کو۔ انھیں پتا تھا کہ "لال کوٹھی" پر ہی ٹپکے گی، بس، پہلے سے چڑھ کر وہاں موجود!"

"کیوں دوارکا، اس "لال کوٹھی" میں اب تک مجھے کوئی صورت نہیں دکھلائی دی! کون رہتا ہے اس میں؟"

میں نے تعجب سے پوچھا۔

"مکان تو اتنا عالی شان ہے مگر اس کی کھڑکیوں کے پٹ کبھی کھلے نہیں دیکھے —— نہ کبھی گھا گرا یا اوڑھنی ہی سوکھتی دیکھی ہے۔ کس کا مکان ہے؟"

"ارے، کیا بتائیں! ...... اس کا لمبا قصہ ہے پچھلے تین سال سے تو خالی ہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بھوت رہتے ہیں۔"

بدری —— دو گلاس لسّی لئے کھڑا تھا۔ دوارکا ایک گلاس مجھے دے کر دوسرا آپ لیتا ہوا بولا —

"کیوں رے، بدریا، پھر "لال کوٹھی" میں اب تک کوئی نہیں آیا؟ سنتے ہیں اسے کوئی خرید رہا تھا؟"

"کون مول لے سی مالک، اسے بھوتیا گھر نے!" بدری بھویں تان کر آنکھیں مٹکاتا ہوا بولا۔ "کے ری شامت آئی جی کو اُٹھے مرن واسطے رے سی —— شیاما رتن جی کا بیٹے ہے ای میں!"

خالی گلاس کھن کھن بجاتا ہوا بدری نیچے چلا گیا۔ "کیوں، دوارکا،" میں نے پوچھا، "بھوتیا گھر، شیاما رتن،

یہ کیا معاملہ ہے ؟"

"معاملہ واملہ کچھ نہیں - ایک چھوٹی سی درد بھری محبت کی کہانی ہے ۔ بات ویسے تو ذرا لمبی ہے - مگر موٹر آنے میں ابھی دیر ہے - اگر سُننا چاہتے ہو تو سُن لو -"

"ذرا ٹھہرو،" میں نے کہا، "کمرے سے سگریٹ کا ڈبہ لے آؤں -"

پیچھے پر پتھر کی بنی ہوئی ایک بنچ تھی، اسی پر ہم لوگ بیٹھ گئے دوارکا، منھ سے دھوئیں کے گول گول لچھے اڑاتا ہوا "لال کوٹھی" کی چوتھی منزل کی ایک کھڑکی کی طرف ہاتھ سے اشارا کرتا ہوا بولا۔

"اُسی کھڑکی سے میں نے اُسے پہلی بار جھانکتے ہوئے دیکھا تھا -"

"کسے ؟" میں نے پوچھا۔

"شیاما کو ——— اس کا پورا نام شیام کنوری تھا - لیکن تم ایسے نہیں سمجھو گے - اچھا، تو سنو، بالکل شروع سے کہتا ہوں . . . . . جب سیٹھ سُگن چند کی یہ "لال کوٹھی" بن کر تیار ہو گئی تو اُنھیں فکر ہوئی کہ اُن کے بعد اس عالی شان عمارت میں کون رہے گا - سُگن چند کی عمر ڈھلتی پر تھی اور عورت مر چکی تھی - اولاد کوئی نہ تھی - اس عمر میں دوسری شادی کر کے اولاد کی امید کرنے کے بجائے کسی لڑکے کو گود لے لینا ہی انھوں نے

زیادہ مناسب سمجھا۔ سیٹھ جی سٹہ کھیلنے کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ایک اور ایک گیارہ نہ گِن کر صرف دو ہی گِننا اچھی طرح جانتے تھے اور اسی سبب سے مطلبی لوگوں کے بے ہودہ بہکاوے میں نہ آکر انھوں نے ایک رشتہ دار کو، جس کا نام چمپالال تھا، گود میں لے لیا۔ اور اُسی سال اپنے اس متبنّٰی لڑکے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کر کے سیٹھ شگن چند نے اپنی لال کوٹھی آباد کرلی۔

"چمپالال کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کی کئی مرتبہ پتنگ کاٹی تھی۔ اس کی شادی میں میں بھی مدعو تھا۔ جس سال اس کی شادی ہوئی۔ اسی سال سیٹھ شگن چند نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ چمپالال ہی اب اُن کی ساری جائداد کا مالک ہوا۔

"چمپالال کی عورت شیام کنوری جودھ پور سے آئی تھی اکیلی نہیں۔ ساتھ میں بہت سا دھن، بہت سے کپڑے، بہت سے زیورات، بہت سا حسن، بہت سی اُمنگیں اور بہت سی اُمیدیں ساتھ لائی تھی —— ہاں، اور ایک پریمی بھی ساتھ تھا۔ معلوم ہوتا ہے رتن سنگھ سے اس کا پرانا تعلق تھا۔ جب شیاما جودھ پور سے بیکانیر چلی آئی تو رتن سنگھ کو اس کی جدائی مشکل ہوگئی۔ رتن سنگھ راجپوت تھا۔ تھوڑی سی زمین اور بڈھی ماں ہی اس کی ساری جائداد تھی۔ ماں نے پہلے تو

رتن کو جودھ پور چھوڑنے سے روکا۔ مگر اُس نے زیادہ ضد کی، اور کہا کہ بیکانیر سرکار کی پلٹن میں اُسے نوکری مِل رہی ہے تو بے چاری نے آنکھوں میں بہت سا پانی لاکر اجازت دے دی۔ رتن نے ماں کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ مگر اُس نے اپنا پُرانا گھر چھوڑنا پسند نہ کیا۔

"رتن سنگھ کو سچ ہی بیکانیر کی پلٹن میں جگہ مل گئی۔ وہ اپنی ماں کو برابر خط و خطوط لکھتا رہا اور مہینہ میں ایک دو بار وہ خود جودھ پور جاکر اُسے دیکھ بھال بھی آتا۔

"نہ جانے کیسے، رتن سنگھ اور چمپالال میں دوستی ہوگی اور روز رات کو دونوں میں شطرنج کی بازی جمنے لگی۔ کھیلتے وقت رتن کی آنکھیں شطرنج کے پٹ پر ہوتیں، اور ہاتھ مہروں پر ہوتا، کان بیٹھک کے کنارے والے دروازے پر ہی ہوتے۔ آہستہ سے آہستہ پیروں کی آواز اور دھیمی دھیمی چوڑیوں کی کھنک بھی اُس کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی۔ ایک دن رتن نے دیکھا دروازے کی دراز میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ چمپالال کے پیچھے کھونٹی پر رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ رتن اپنے کوٹ سے رومال نکالنے کے بہانے اُٹھا اور دھیرے سے اُس نے وہ کاغذ کا ٹکڑا کھینچ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔"

"ہاں، تو۔" دوارکا نے ایک لمبا کش لے کر سگریٹ

کا ٹکڑا پھینک دیا، رتن جب گھر لوٹا تو سب سے پہلے اپنی جیب سے اُس کاغذ کے ٹکڑے کو نکال کر قندیل کے پاس گیا اور پڑھنے لگا۔ اُس میں لکھا تھا۔ پیچھے کی چھت کا کواڑ کھلا رہے گا۔ رات کو گیارہ بجے،

"تب سے رتن اور شیاما برابر ملتے رہے۔ شیاما نے شاید نوکر، نوکرانیوں کو ملا لیا تھا۔ جب رتن کو شیاما سے ملنا ہوتا۔ یا جب شیاما کی نوکرانی گوپی، اُس کے لئے بُلوا لاتی، رتن فوراً دیوار پھاندکر لال کوٹھی کے پیچھے والی چھت پر جا پہنچتا۔ یہاں کے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں ایک دوسرے سے کس طرح ملی ہوئی ہوتی ہیں، تمھیں معلوم ہی ہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر میں داخل ہو جانا۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ اور پھر لال کوٹھی کی وہ پیچھے والی چھت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ خیر کئی مہینے بیت گئے۔ شیاما اور رتن کی محبّت کی ملاقاتیں چلتی رہیں، اور چمپا لال کو اس کا کچھ بھی احساس نہ ہوا۔

"شیاما۔ رتن کو کہاں تک چاہتی تھی یا رتن شیاما کو کتنا پیار کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ جب کبھی مذاق کرتا ہوا رتن اُس سے کہتا: "ماں نے مجھے بلایا ہے، اور اب کی شاید میں نہ لوٹوں، تو شیاما کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے، "اگر تم نہ لوٹے تو، وہ کہا کرتی، تو میں زہر کھا لوں گی، رتن اُس سے

گالوں کو چوم کر کہتا: "پگلی کہیں کی، ایسا کبھی ہو بھی سکتا ہے؟"
پھر اس کا چہرہ مرجھا جاتا۔ وہ کہتا: "شیاما، تم اگر میری ہی عورت ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا!"

"قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے، رتن!" رتن کے گالوں پر وہ اپنے ملائم ہاتھ پھیرنے لگتی۔ "میں نے اپنی طرف سے تو کچھ بچا نہیں رکھا ہے...... سب کچھ تمھیں کو دیا ہے..."

"ہاں، شیاما، میں بڑا مطلبی ہوں، شاید اپنے حصہ سے زیادہ چاہتا ہوں"

"رتن"، شیاما اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی، "چلو، کہیں بھاگ چلیں ——— دور ——— بہت دور......"

"میرے پاس تو دھن دولت ہے نہیں۔ یہ کپڑے، یہ زیور، یہ نوکر چاکر، یہ مکان، یہ آرام، تمھیں وہاں میرے ساتھ کیسے نصیب ہوگا، شیاما؟"

"مجھے یہ کچھ نہیں چاہیئے"، وہ کہتی۔ "تمھارے ساتھ جہاں چاہوگے، میں چلی چلوں گی"، پھر وہ رونے لگتی۔

"ایک پورنیما کی رات کا میں اب ذکر کرتا ہوں۔ قریب بارہ بجے ہوں گے۔ بالکل سناٹا تھا۔ لال کوٹھی میں لگی ہوئی رات کی رانی مہک رہی تھی۔ اور اس کھڑکی میں ———" دوارکا نے پھر "لال کوٹھی" والی چوتھی منزل کی اسی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

شیاما اور رتن بڑی دیر سے ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے، آسمان میں چاند اور بادلوں کے مناظر دیکھ رہے تھے شیاما رہ رہ کر کچھ پریشان سی ہو پڑتی تھی۔

"تم آج کیوں آئے؟" شیاما نے پوچھا۔ میں نے گوپی کے ہاتھ کہلا بھی بھیجا تھا کہ آج نہ آنا ـــــ تم سے نہیں کہا۔ اُس نے؟

"کہا تھا۔ پر کل میں جودھپور جا رہا ہوں۔ ماں بیمار ہے سوچا، جانے سے پہلے تم سے ملتا جاؤں۔ معلوم نہیں کب آنا ہو..... شیاما، نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ اپنی آخری ملاقات ہے!"

"نہیں، نہیں، رتن، ایسا نہ کہو،" شیاما نے اس کے منھ پر منہدی رچی اپنی لال ہتھیلی رکھ دی۔ ایسا نہ کہو، تمھارے بغیر میں کیسے جی سکوں گی۔!..... مگر تم ابھی چلے جاؤ"

"کیوں؟"

"آج میں اُن کے ساتھ....."

"تو پھر اُنھوں نے آنے کیسے دیا؟"

"وہ سو رہے تھے، گوپی نے چپکے سے آکر مجھے جگایا اور میں"

"چپکے سے اُٹھ کر چلی آئی؟"

"چلے جاؤ"، رتن، شیاما نے پریشان ہوتے ہوئے کہا

چلے جاؤ - دیکھا کہیں ان کی نیند ٹوٹی اور انھوں نے مجھے نہ پایا تو ———‘

”اچھا، شیاما، رتن نے اس کی آنکھوں میں حسرت بھری نگاہ سے دیکھا، مگر آج تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو!“ پھر اس نے اس کے نازک گالوں کو چوما، اس کے خوشبودار بالوں کو چوما، چاندنی میں جگمگاتے ہوئے اس کے لال جڑاؤ بور کو بھی چوما،“

”بور کیا چیز؟“ میں نے پوچھا،

”بور؟ مارواڑی عورتوں کے ماتھے پر ایک گول زیور تم نے نہیں دیکھا ——— سنکل میں بندھا ہوا ہوتا ہے؟“

”اچھا، جو سرچ لائٹ، کی طرح ——— وہی تو نہیں؟“

”ہاں، ہاں، وہی،“ دوارکا نے ہنس کر کہا۔ ”بور سہاگ کی نشانی ہے..... ہاں، تو اسی وقت ٹن سے ایک بجا۔ شیاما اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”جاؤ، رتن، بھاگ جاؤ جلدی سے“

”تمھارا بور کتنا خوبصورت ہے! تمھارے ماتھے پر کتنا بھلا لگتا ہے —! معلوم ہوتا ہے کہ میں تمھارے اس بور سے بھی محبت کرنے لگ گیا ہوں۔

”یہ بور تمھارے ہی لئے تو پہنتی ہوں، رتن ——

" اسی لمحہ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف۔

" رتن! ' شیاما نے گھبرا کر کہا '

" رتن نے اُسے اور زور سے جکڑ لیا۔ دروازے کی کنڈی کسی نے کھٹکھٹائی۔ شیاما کے ماتھے پر بڑے بڑے موتی جھلکنے لگے۔ اُس نے — اپنے کو چھڑا لیا۔ دوڑ کر وہ دروازے پر گئی، پھر لوٹ آئی — ' شاید وہ ہیں! ' اُس نے کراہ کر کہا '

" کنڈی برابر بج رہی تھی۔"

" کون ہے؟ ' شیاما نے زور سے پوچھا '

" میں، کھولو '

" آواز چمپا لال کی تھی۔

" شیاما نے رتن کا ہاتھ پکڑ کر کہا ' بھاگ نکلو کہیں سے، رتن.... سنو، جلدی کرو — '

" رتن کی نظر بڑی تیزی کے ساتھ اُس کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھنے لگی۔ دروازہ وہی ایک تھا۔ جس پر چمپا لال کھڑا تھا.......... رتن سہم گیا۔

" رتن، رتن — میری عزت رکھ لو، رتن.... '

شیاما کا گلا سوکھ گیا '۔ وہ بجلی کی طرح کانپ اُٹھی۔

" رتن نے پھر سے شیاما کو پاس کھینچ لیا۔ اس کے گالوں کو

ایک بار پھر سے چوما ــــــ اس کے بور کو بھی چوما، اُس کی آنکھوں میں ایک لمحہ پھر اُسی درد، آہ اور پیار بھری نگاہ سے دیکھا، جاؤ شیاما، کھول دو دروازہ، اس نے کہا، اور دوسرے لمحے وہ کھڑکی کے پاس تھا۔

"جیسے ہی شیاما نے دروازہ کھولا اور چمپالال اندر داخل ہوا، اس کھڑکی کے نیچے والی گہری سنسان اندھیری گلی میں، بھد، کی ایک آواز ہوئی جو صرف شیاما ہی کے کانوں تک پہنچ سکی ......"

"شیاما"! چمپالال نے اپنی عورت کے دونوں کندھوں کو ہاتھوں سے پکڑ کر کہا، ابھی ابھی میں نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے!

تم ــــــ تم چلی کیوں آئیں ؟'

"وہاں بڑی گرمی تھی، مجھے نیند نہ آئی،"

"میں بھی نہ سو سکا، نیند میں مجھے بڑا بھیانک خواب دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم لوگ پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ یکایک تمھارا پیر پھسل گیا اور تم چٹان کے نیچے گر گئیں۔ میں دوڑ کر تمھارے پاس پہنچا مگر... تم ... تم .... مگر .... اچانک میری نیند کھل گئی، اور جب میں نے تمھیں بستر پر نہ پایا تو"

"شیاما نے اپنی اوڑھنی سے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا اور

مسکرانے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"کیوں، تم کانپ کیوں رہی ہو؟"

"کہاں کانپ رہی ہوں؟ شیاما کی آواز بے سُری تھی

"کیا بات ہے شیاما؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"میں ــــ اچھی ہوں، تمھیں گھبرائے ہوئے ہو، اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی مگر پہلے ہی کی طرح مایوسی رہی"۔

"کونے میں پلنگ پڑا ہوا تھا۔ چمپالال نے شیاما کو اسی پر بیٹھا دیا اور آپ بھی اس کے بازو میں بیٹھ گیا، شیاما نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے، بولو تو؟ ...... ارے تم تو پسینہ میں تر بتر ہو شیاما!" مجھ سے کہو، چمپالال نے آج بڑے پیار کے ساتھ اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر سر اوپر اُٹھایا" شیاما ــــ، شیاما ......"

"شیاما بیہوش ہو چکی تھی۔"

دوارکا نے ایک لمبا سانس لیا، دوسری سگریٹ جلائی اور پھر داستان شروع کر دی۔

"صبح کو سارا بیکانیر اس گلی میں اُلٹ پڑا۔ رتن کا مردہ جسم گلی میں لہولہان پڑا ہوا تھا۔ پولیس نے تحقیقات کی، کسی نے کہا، موٹر سے ٹکرا گیا ہوگا۔ کوئی بولا، کسی نے ڈنڈے سے

مارا ہے، خیر، قصہ کوتاہ کچھ پتہ نہ چلا . . . . !

" ادھر شیاما کا حال بُرا تھا - اس رات جب اُس کی بیہوشی دور ہوئی تو بخار چڑھ آیا اور بڑھتا ہی گیا - جیسے تیسے بیتا، دو دن بیتے، تین دن بیتے...

اس کی حالت بدتر ہی ہوتی گئی، بخار میں اس نے بہت کچھ بڑبڑایا - ہر وقت "رتن" "رتن" کی رٹ لگائے رہتی - چوتھے، یا پانچویں دن صبح کے ساتھ ساتھ "لال کوٹھی" کی شمع بھی گُل ہوگئی . . . . چمپا لال کی تلاش ہوئی، مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا - لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے سنیاس لے لیا - بعد میں یہ بھی خبر اُڑی کہ کسی نے اُسے بمبئی میں دیکھا ہے - خیر، لیکن اُس دن سے "لال کوٹھی" سونی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس میں شیاما رتن کا بسیرا ہے . . . . ."

دوارکا کی، درد بھری محبت کی کہانی، ختم ہوچکی تھی، میں جانتا تھا کہ دوارکا شاعر ہے اور اس کا شاعرانہ دل "لال کوٹھی" والے - کسی واقعہ کو درد بھری کہانی، بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھے گا، پھر بھی اُس کی، درد بھری محبت کی کہانی، نے مجھ پر پورا پورا اثر کیا - وہ خود بھی بنچ پر بیٹھ

کی مورتی کی طرح بیٹھا ہوا "لال کوٹھی" کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی بدری نے آکر کہا "مالک، موٹر تیّار ہے۔"

اِمتحان

وکالت کے امتحان میں جب کیلاش لگاتار دو مرتبہ فیل ہو گیا تو پتا جی نے جھنجھلا کر ماں جی سے کہا "کہتا نہ تھا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی لڑکے کی شادی نہ کرو، پہلے اُسے وکالت کر لینے دو، مگر تمھیں تو گھر میں بہو لانے کی پڑی تھی لو، اب آرتی اُتارو اپنے بیٹے کی۔"

"ایسا کیا غضب ہو گیا جو تم تِل کا تاڑ بنا رہے ہو؟" ماں جی بھی بگڑ پڑیں "دنیا میں جیسے اور کسی کا لڑکا فیل ہوا ہی نہ ہو گا۔ پڑھا تو تھا بیچارے نے۔"

"جی ہاں، خوب پڑھا تھا۔ دن رات بہو کے آس پاس چکر کاٹنے سے کوئی امتحان میں پاس نہیں ہو جاتا۔ جب دیکھو، تب گراموفون بج رہا ہے، کیرم کھیلا جا رہا ہے، موٹر پر سیر ہو رہی ہے — آخر پڑھائی کے لئے وقت ملے بھی تو کیسے ملے!"

ذرا تم اپنی تو کہو۔ تمھیں نے کون تیر مار لیا تھا؟ میرے آنے کے بعد وہ دن بھول گئے۔ جب میرے پاس بیٹھے بیٹھے میرے پیٹی کوٹ سِیا کرتے تھے؟ آخر تک تو بی، اے، پاس نہ کر سکے۔"

"آپ کی مہربانی کا میں مشکور ہوں"، پتاجی نے طعنہ کسا، مگر اب اپنے بیٹے کی زندگی تو برباد نہ کرو"، میرا تو نبھ گیا جیسے تیسے"۔

"ایشور اس کا بھی نبھا دے گا" ماں جی نے کہا، پھر مسکرا کر بولیں، "خود تو بی اے میں تین بار فیل ہوئے تھے، کیا وہ بے چارہ وکالت میں دو بار بھی نہ ہو؟"

اپنی باتوں کا کچھ اثر نہ دیکھ کر پتاجی نے اور زیادہ فکرمند صورت بنا کر، بجھا ہوا چورٹ پھر سے سلگایا۔ "دیکھو جی"، انھوں نے کہا "بات ہنسی میں نہ لے جاؤ۔ لڑکے کی زندگی کا سوال ہے! اگر اسی طرح ایک بار اور فیل ہوا تو اس کا حوصلہ ہی جاتا رہے گا۔ کہے دیتا ہوں، بغیر وکالت کیے کوئی چارہ نہیں، وہ دن گئے۔ جب نوکری خود سر کے بَل دوڑی چلی آتی تھی۔"

ماں جی کی سمجھ میں پتاجی کی بات تو نہیں آئی، مگر اُن کی فکرمند آواز کا ضرور اثر ہوا "تو تم آخر چاہتے کیا ہو؟" وہ بولیں۔

"یہی کہ آپ کی بہو کو میکے بھیج دیا جائے اور جب تک کیلاش کا امتحان ختم نہ ہو جائے اُسے واپس نہ لایا جائے۔"

پتاجی کا یہ خیال ماں جی کو ذرا عجیب معلوم پڑا۔ یہ تو کیلاش اور بہو پر زیادتی ہوگی، بے انصافی ہوگی۔ مگر پتاجی کا چوروٹ سلگ چکا تھا، اُن کے منھ اور نتھنوں سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکل کر موچھوں کے گھنے بالوں میں لپٹ رہا تھا۔ بات کاٹنے کی ماں جی کی ہمت نہ ہوئی، بات کاٹنا تھا بھی بیکار۔ اب تو وہ ہوکر ہی رہے گی، کیوں کہ بہو نے یہ باتیں ضرور سُن لی ہوں گی دروازے کی آڑ میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اُس کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔"

چائے کی پیالی لئے بہو اندر آئی اور پتاجی کو پکڑا کر چپ چاپ چلی گئی۔

چوروٹ کے سرے پر جمی ہوئی راکھ کی لمبی تہہ کی طرف دیکھتے ہوئے پتاجی نے دھیرے سے کہا؛

"شاید سُن لیا بہو نے!"

"سُنے گی نہیں! ایسی باتیں بھلا اتنے زوروں سے چِلّا کر کہی جاتی ہیں؟ ...... نہ جانے دل میں کیا سمجھتی ہوگی بیچاری۔"

پتاجی کو اب پشیمانی ہونے لگی، غصّہ اُنھوں نے چوروٹ پر نکالا۔ نہ ماں جی پر رعب جمانے کے لئے وہ چوروٹ سلگاتے اور نہ آواز ہی اُتنی اونچی چڑھتی۔ دل ہی دل میں غصّہ ہو کر

انھوں نے چروٹ پھینک دیا اور پیالی منھ سے لگائی، گرم چائے سے زبان جھلسی جانے پر ہوش آیا کہ وہ شام کی چائے پی رہے ہیں صبح کی لسّی نہیں۔

"تشتری میں انڈیل لو نا" ماں نے اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ "ایسی گرم گرم کیوں پی رہے ہو؟"

"کیا گرم چائے پینا گناہ ہے؟" پتاجی تنک اٹھے۔

"پیٹو، میرا کیا؟ تمھارے ہی بھلے کے لئے کہہ رہی تھی کہ کہیں منھ ونھ نہ جلا بیٹھو"

جھلسی ہوئی زبان اینٹھ رہی تھی۔ مگر پتاجی کی اکڑ کم نہ ہوئی۔ "آدمی چائے پیئے تو گرم پیئے،" انھوں نے کہا، "ورنہ تمھارا بنایا ہوا کیوڑے کا شربت کیا برا ہے؟"

"اچھا بابا شوق سے پیؤ۔ کہو تو اور لادوں بنا کر ایک پیالی ابلتی ہوئی۔"

پتاجی کو اب سچ میں غصہ آگیا۔ "جاؤ جی یہاں سے، یہ ٹیں ٹیں بند کرو،" انھوں نے کہا؛

"یہ لو میں ابھی چلی، لیکن ذرا ادھر تو دیکھو تم نے وہ کیا کر دیا۔"

پتاجی نے دیکھا، موڑھے کے پاس ہی دھوئیں کی پتلی سی ایک لکیر اوپر کو اٹھ رہی ہے۔ لپک کر انھوں نے وہاں پڑا ہوا چروٹ

اُٹھا لیا، لیکن ابھی خریدے ہوئے اُن کے بہت بڑھیا قیمتی قالین میں سوراخ پڑ چکا تھا۔

"تم بھی کھڑی دیکھتی رہیں ـــــ پہلے بھی نہیں بتلایا !" چائے کی پیالی میں چرُوٹ بجھاتے ہوئے پتاجی نے ماں جی کو پھٹکارا،

"لو اب دل کی ہوئی تمہارے ؟"

مگر جواب دینے کے لئے وہاں تھا کون ؟ ماں جی کب کی چلتی بنیں ۔

پتاجی اُبل اُبل کر رہ گئے 'لیڈر' کو ـــــ جس میں وکالت فائنل کا نتیجہ چھپا تھا ـــــ اُنھوں نے دور دے مارا ۔ ہوا کے جھونکے سے اُڑ کر اخبار کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی ایک تکونی میز کے پیروں سے جا لپٹا اور زور زور سے وہاں پھڑپھڑانے لگا ۔ دل کی آگ بجھانے کے لئے پتاجی کو دوسرا چرُوٹ سلگانا پڑا ۔ 'نہیں، بہو کو میکے بھیجنا ہی ہوگا' انھوں نے دل میں کہا ایسے تو کیلاش جنم بھر امتحان دیتا رہے ۔ کبھی پاس نہ ہوگا

پاس نہ ہونے کا غم پتاجی سے بھی زیادہ کیلاش کو ہوا ـــــ اس لئے نہیں کہ اس کا ایک سال اور جاتا رہا ۔ بلکہ اس لئے کہ اس کے فیل ہونے کا اصل سبب اپنے کو سمجھ 'مایا' بہت دُکھی ہو گئی ۔ کیلاش سے آنکھ تک، وہ اب نہیں مِلاتی "ایسی عورت کس کام کی جو شوہر کی ترقی میں رُکاوٹ ہو ۔" اس نے ایک دن

کیلاش سے کہا۔

"تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟ کہ میری ترقی میں تم رکاوٹ بنی ہو؟" کیلاش نے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا؟" مایا بولی میرے اس گھر میں آنے سے پہلے تو تم کبھی فیل نہیں ہوئے تھے۔

"تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے"؟ کیلاش مسکرایا۔ "تمھاری جیسی جیون ساتھی پاکر بھی اگر میں امتحان پاس کرجاتا' تو اس سے بڑھ کر تمھاری اور کوئی توہین نہ ہوتی۔ میرا فیل ہونا ہمارے سکھی جیون کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ سمجھیں؟"

"جی، مگر وہ ثبوت تو تم پچھلے سال ہی دے چکے تھے کیا اس کا اس سال بھی دوہرانا ضروری تھا؟"

کیلاش قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "دیکھو، مایا دیوی' ناراض نہ ہو" وہ بولے۔

"اپنی یونیورسٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب کے پاس ہوئے بغیر نہ رہوں گا۔ بس؟"

"یہی تو اچھا نہیں لگتا۔ جو تم بات ہمیشہ ہنسی میں اُڑا دیا کرتے ہو۔ ماں جی' پتاجی دل میں کیا کہتے ہوں گے؟"

"یہی کہ لڑکا بڑا ہونہار نکلا —— یونیورسٹی اگزامنیشن تک اس کی بہترین پتی بھگتی میں خلل نہ ڈال سکا۔"

بہت کوشش کرنے پر بھی مایا ہنسی نہ روک سکی "جاؤ، میں اب تم سے کبھی نہ بولوں گی" اس نے کہا۔

آنچل پکڑ کر کیلاش اُسے اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا "ارے نہیں ایسا کروگی تو غضب ہو جائے گا! سچ مانو، اس بار ضرور پاس ہو جاؤں گا ایک موقع اور دو۔"

"نا، مجھے تمھاری باتوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں، میرے رہتے تم کبھی پاس نہیں ہو سکتے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟ ہندو قانون اجازت نہیں دیتا ورنہ تمھیں طلاق دے دیا ہوتا۔"

"کچھ دنوں کے لئے میں میکے چلی جاتی ہوں۔ تمھارا امتحان ختم ہونے پر چلی آؤں گی۔"

"یہ عقل مند صلاح شاید تمھیں پتا جی نے دی ہے۔؟"

وہ کیوں دینے لگے؟ میں ہی کہہ رہی ہوں۔"

کیلاش کو بات پسند نہ آئی۔ آتی بھی کیسے؟ سال بھر مایا سے دور رہنا۔ اُس کے لئے مشکل امر تھا۔ مگر جب مایا نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے سمجھایا کہ وہ سال بھر کے لئے نہیں۔ بلکہ سات، آٹھ مہینے کے لئے جا رہی ہے اور امتحان ختم ہوتے ہی لوٹ آئے گی، پھر دسہرا، دیوالی، کرسمس کی چھٹیوں میں وہ اسے دیکھنے آتا رہے گا تو بڑی

ہمت کر کے کیلاش راضی ہو گیا۔

جانے سے پہلے مایا نے کیلاش سے وچن لے لیا کہ وہ برابر پڑھتا رہے گا۔ لیکن جب وہ چلی گئی، تو پڑھائی اور محال ہو گئی۔ مایا کی موجودگی میں تو وہ پڑھنے کو ہی بہت کم بیٹھتا تھا۔ مگر جب بھی کبھی وہ کتاب ہاتھ لیتا — چاہے تھوڑے ہی وقت کے لئے کیوں نہ ہو۔ اُس کے دماغ و عقل میں ایک ایک حرف بیٹھ جاتا تھا۔ اور اب — جب سے اس کی مایا میکے چلی گئی ہے — تمام دن کتابوں میں وہ آنکھ گڑائے رہتا ہے۔ مگر سمجھ میں، خاک نہیں آتا۔ کتابوں کے کالے کالے حروف چیونٹیوں کی طرح قطار باندھے اس کی نظر کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ منٹوں گذر جاتے اور وہ ورق نہ اُلٹ پاتا۔ اور جب اُلٹتا تو بیشتر پیچھے کی طرف!

"کیلاش مایا" شبستان کو کیلاش کے مطالعہ گھر بنانے کے لئے، وہاں لٹکے ہوئے رومانٹک تصویروں کو ہٹا کر پتاجی ڈھیر ڈھیر اُن کی جگہ پر شنکر جی، ہنومان جی، گنیش جی اور بھی دیگر دیوتاؤں کی تصویریں لگا دیں۔ مگر دیوتا لوگ بھی کیلاش کی مدد کرنے میں ناکام رہے۔

دیواروں پر ٹنگے وہ اونگھا کرتے اور کیلاش کتابوں کے ورق میں مایا کا چہرہ دیکھا کرتا۔ . . . .

اوپر کے کمرے میں رات بڑی دیر تک بجلی جلتی دیکھ، ایک دن

خوش ہو کر پتا جی نے ماں جی سے کہا۔ دیکھا اب کیسے پڑھائی ہو رہی ہے! کہتا نہ تھا میں کہ بہو کے جانے کے بعد اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا؟"

"کون جانے پڑھائی ہو رہی ہے یا چٹھی لکھی جا رہی ہے"، ماں جی نے کہا، پھر بھوئیں چڑھا کر بولیں گھر سونا کر کے رکھ دیا تم نے تو!"

پتا جی جانتے تھے دل کا غبار نکلنے کا ماں جی موقع ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اگر انھوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو آج اُن کی خیریت نہیں۔ لہٰذا جلدی چوروٹ سُلگا کر۔ اُنھوں نے مضمون بدل دیا

دن گذرنے لگے۔ دسہرا آیا، پھر دیوالی، پھر کرسمس تینوں چھٹیوں میں کیلاش مایا سے مِل آیا۔ کیلاش کے لاکھ چھپانے پر بھی مایا نے تاڑ لیا کہ پڑھائی نہیں ہو رہی ہے پچھلی بار اُس نے اپنی قسم دے کر کہا تھا کہ پڑھنے میں وہ دل لگائے " اب میں تب تک تم سے نہیں ملوں گی۔ جب تک تمھارا نتیجہ نکل نہیں جاتا ___ جب تک تم پاس نہیں ہو جاتے۔" کیلاش جانتا تھا کہ مایا بات کی پکّی ہے۔ اگر اس بار پھر فیل ہو گیا تو اُسے بنا مایا کے ایک اور لمبا سال کاٹنا ہوگا۔ اس خیال سے ہی اس کا دل کانپ اُٹھا۔ نہیں، جیسے بھی ہو، اُسے امتحان پاس کرنا ہی ہوگا مایا کو پانے کے لئے مایا کو بھولنا ہوگا۔ مصیبتوں کا اندیشہ کر کے

جب کمزور انسان اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے کمر کستا ہے، تو سچ میں، یقین بھی نہیں ہوتا کہ کبھی وہ کمزور بھی تھا - اُس کی اس اچانک دلیری کی مہر اُن لوگوں تک کے دلوں پر لگ جاتی ہے، جو اپنے کو دُنیا کے سامنے بلند حوصلہ قرار دیئے بیٹھے ہیں - کیلاش نے پڑھائی میں دن اور رات ایک کر دیئے -

ناک بند کر کے جس طرح مریض ایک سانس میں کسٹرائل پی جاتا ہے، اسی طرح کیلاش اپنے جذباتی دل پر غلاف چڑھا کر وکالت فائنل کے سارے پرچے دے آیا - اور پھر، جیسا کہ لازم تھا، اُسے اُبکایاں آنے لگیں - جی ہونے لگا کہ کتابوں پر اسٹو کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے - دیوتاؤں کی تصویریں اس کو اپنے شبستان میں کھٹکنے لگیں - مایا کے لئے اُس کا دل ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح، تڑپنے لگا - لیکن جب تک کیلاش کے پاس ہونے کی خبر نہیں ملتی، وہ نہیں لوٹے گی - کیلاش نے بہتیرا لکھا مگر وہ نہ مانی، اور نہ اُسے ہی اپنے میکے آنے کی اجازت دی - کیلاش دل مسوس کر رہ گیا - اُسے پوری اُمید تھی - کہ وہ اب کی یقیناً پاس ہو جائے گا - اسی امید میں رزلٹ آوٹ ہونے تک مایا کا نہ لوٹنا اُسے جہالت معلوم ہوئی - دل ہی دل میں وہ پتاجی پر بہت جھنجھلایا - اُسے یقین تھا کہ مایا سے اُسے جُدا کرنے کی سازش پتاجی کی ہی رچی ہوئی تھی - کاش

اُس دن مایا بھی یہاں موجود ہوتی - جس دن اس کے امتحان کا نتیجہ نکلے گا —— جس دن اس کی کامیابی کی خوشخبری ملے گی! اُس کی کامیابی کا سہرا جس کو ہو، بھلا کیا اُسے ایسے موقع پر غیر حاضر رہنا چاہیئے۔؟

کیلاش نے نتیجہ نکلنے کے ایک دن پہلے مایا کو تار دے کر خبر دی کہ وہ جلدی چلی آئے، اس کی طبیعت خراب ہے - مایا نے فوراً جواب دیا کہ وہ میل سے روانہ ہو رہی ہے - تار دیکھ کر ماں جی، پتاجی بہت حیران ہوئے - پوچھنے لگے کہ بات کیا ہے کیلاش نے کہہ دیا، بہو آ رہی ہے - پتاجی تو کچھ نہ بولے، صرف چوروٹ سُلگا کر رہ گئے - مگر ماں جی نے، مارے خوشی کے، سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا -

دوسرے دن بہت تڑکے اُٹھ کر کمروں کی صفائی وغیرہ شروع کر دی، صبح سے دوپہر تک کوئی بیس مرتبہ انھوں نے کیلاش کے پاس آکر وقت پوچھا ہو گا - جیسے کیلاش کے لئے یہ ممکن تھا کہ بہو کو لینے اسٹیشن جانا بھول جاتا -

جلدی جلدی کپڑے پہن، وقت سے گھنٹہ بھر پہلے، برآمدے میں بیٹھے اخبار کا انتظار کرتے ہوئے پتاجی کی آنکھ بچاکر، کیلاش موٹر لئے اسٹیشن کو چل پڑا!

پتاجی سُن رہ گئے - جب انھوں نے اخبار میں کیلاش کا

نام نہ پایا، یعنی اس سال پھر وہ غوطہ کھا گیا -! اتنا پیسہ، قیمتی وقت فضول برباد ہو گیا! چوروٹ سُلگانے لائق ہمت بھی پتا جی میں اب نہ رہی - آرام کرسی پر بیٹھے، اخبار کے جس حصہ پر وکالت فائنل کا نتیجہ نکلا تھا، وہ ایک ٹک دیکھنے لگے، جیسے کیلاش کا فیل ہونا ناممکن ہے ــــ اس لئے نہیں کہ اس سال اس نے محنت بہت کی تھی، بلکہ اس لئے کہ اتنے قصے اتنی پوجا پاٹ بیکار نہیں جانی چاہیئے تھی۔

رنج تو ماں جی کو بھی ہوا۔ مگر بہو کے آنے کی خوشی نے اس رنج پر قلعی پھیر دی - موٹر کی آواز سنتے ہی برآمدے میں دوڑی آئیں۔ ... مگر وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ موٹر سے اکیلا کیلاش ہی سر لٹکائے اُترا، اور لڑکھڑاتا ہوا، برآمدہ، ڈرائنگ روم ہوتا، اوپر اپنے کمرے میں جاکر، دھڑام سے پلنگ پر گر پڑا۔ کسی بھیانک خیال سے ماں جی کانپ اُٹھیں۔

"کیا ہوا کیلاش؟ بہو نہیں آئی؟" انھوں نے پوچھا

کیلاش کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "نہیں، ماں جی، نہیں آئی بہو....."

اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "گاڑی اُلٹ گئی ــــ"

"کون سی گاڑی؟ ماں جی نے آنچل کا کنارا مٹھی میں زور سے کس کر پوچھا!

"میل — جس سے بہو آ رہی تھی — راستے میں — اُلٹ گئی!"

ماں جی کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا "ہائے رام! میرا تو گھر لٹ گیا!" وہ چیخ اُٹھیں اور سر پیٹ کر رونے لگیں۔

کیلاش، پاگل کی طرح آنکھ پھاڑے۔ ماں کی طرف دیکھنے لگا، جیسے اُن کے رونے پیٹنے کا سبب وہ نہیں جانتا۔ کیا اس کی مایا سچ میں — نہیں، ایشور ایسی بے انصافی کبھی نہیں کرسکتا۔ نہیں! نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا! ایسا نہیں، ہونا چاہیئے! وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا ممکن ہے اس کی مایا بچ نکلی ہو۔ اوہ! لیکن اسٹیشن ماسٹر تو کہتا تھا کہ سات ڈبے اُلٹے ہیں...... پھر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اس کے کوٹ کے کالر کو بھگونے لگے۔ مایا کو کتنا پسند تھا یہ کوٹ! تب ہی تو پُرانا ہونے پر بھی اُسے وہ اکثر پہنا کرتا تھا۔ ہر طرف، کمرے کی ہر چیز میں اُسے مایا دکھائی دینے لگی۔ وہ مایا جس کی قربانی دے کر امتحان میں کیلاش کامیابی حاصل کر رہا ہے۔!

ہائے رے قسمت! تکیہ میں منہ چھپا کر وہ رونے لگا۔

رونا بلکنا سُن پتا جی دوڑے آئے۔ کیا بات ہے؟" اُنھوں نے متعجب ہوکر پوچھا۔

ماں جی سے نہ رہا گیا - "بہو بیٹے کے سُکھ سے زیادہ تمھیں امتحان کی پڑی تھی ! لو، اب روکر لی کو اپنی - ہائے رام ! کیسی اُلٹی سمجھ تھی تمھاری"! انھوں نے کہا -

"یہ کیا بک رہی ہو ؟ کیا ہو گیا ؟" پتا جی نے پوچھا ماں جی نے روکر کہا - میل گاڑی اُلٹ گئی کہتے ہیں !"

کچھ تھوڑا یاد کر کے پتا جی چونک پڑے - "ارے ! میں بہو کا تار دینا ہی بھول گیا تھا" کہتے ہوئے اُنھوں نے کُرتے کی جیب سے تار کا لفافہ نکال کر کیلاش کو پکڑا دیا "لکھا ہے گاڑی چوک گئی، کل نکلے گی میل سے - کیلاش کی حالت تار سے معلوم کرنے کو کہا ہے -"

اپنے ناقابل برداشت دکھ کو ایک دم بے بنیاد پا : تھوڑی دیر کے لئے کیلاش کی آنکھوں کے آگے اندھیاری چھا گئی ایسی بھدی غلطی کر، دُکھ پہچانے کے لئے ماں جی نے پتا جی کو خوب پھٹکارا،

"مجھے پتا ہی نہیں کیلاش کب اسٹیشن چلا گیا" پتا جی نے کہا۔ "اگر مجھ سے ملتا تو میں تار اُسے تب ہی دے دیا ہوتا" پھر اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے ارادے سے، بات پلٹ کر انھوں نے کیلاش کو اخبار دیتے ہوئے کہا :

"آج تمھارا رزلٹ آوٹ ہوا ہے -"

"جی، میں نے دیکھ لیا،" اخبار بازو میں رکھتے ہوئے کیلاش نے کہا۔

"مجھے تم سے یہ امید نہ تھی، کیلاش .... یہ تمھارا تیسرا سال تھا!" کہہ کر پتاجی نیچے چلے گئے۔

کیلاش گم سم کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ ماں جی نے پاس آکر سمجھایا کہ وہ دُکھی نہ ہو ــــــ جان بچی لاکھوں پائے۔ اب کیلاش کی سمجھ میں اصلی بھید آیا۔ پتاجی شاید اس کا نام نہیں دیکھ پائے۔ اخبار کھول کر اس نے ماں جی کو اپنا نام دکھایا یونیورسٹی میں کیلاش پہلے درجہ میں اول آیا تھا۔ اور اس کا نام اخبار میں سب سے اوپر ہونے کی وجہ سے پتاجی اُسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اُن کی آنکھیں نیچے نیچے ہی بھٹک کر نا اُمید ہو گئی تھیں۔ ماں جی خوشی سے پھول اُٹھیں "ذرا ٹھہرو،" انھوں نے اخبار چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ابھی نہ بتانا انھیں۔ تار پہلے نہ دے کر خوب رُلایا ہے انھوں نے ہمیں۔ اب ہماری باری ہے بدلہ لینے کی۔ جب تک بہو گھر میں آ نہیں جاتی، تمھارے پاس ہونے کی خبر انھیں نہیں مل پائے گی۔"

یہ خیال کیلاش کو بہت پسند آیا، بڑی دیر بعد اُس کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔ تار کا فارم نکال کر اس نے مایا کے نام لکھا:

"اچھا ہوں - فرسٹ کلاس، فرسٹ آیا - بدھائی! تمھیں لینے موٹر سے آرہا ہوں۔"

"کیلاش"

جلدی آنا

میز پر پڑے ہوئے کاغذات کا ڈھیر دیکھ کر رما کانت کانپ اٹھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آفس کا کام ختم کرکے شام کو گھر جلدی چلا جائے گا۔ چھ مہینہ کا کمزور بچہ اور نمونیا سے بیمار استری اُس کی آنکھوں کے آگے جھول رہی تھی۔ روز وہ کسی ڈاکٹر کو لے جانے کی سوچتا، مگر وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ صبح آٹھ بجے گھر سے تھانہ اسٹیشن کے لئے پیدل روانہ ہو جاتا، تب کہیں ساڑھے آٹھ کی لوکل اُسے مل پاتی۔ ساڑھے نو تک وہ بمبئی پہنچتا۔ وہاں سے بلیرڈ پیرز اپنے آفس تک اُسے پھر پیدل چل کر جانا پڑتا۔ اگر دس بجے تک آفس پہنچ کر کاغذات کو وہ تفصیل وار نہ لگا پاتا تو اوپر سے ٹومس صاحب کی جھڑکی ملتی۔ ہر روز شام کو چھ، ساڑھے چھ، اور کبھی سات بھی آفس میں ہی بج جایا کرتے۔ گھر پہنچتے پہنچتے نو ہو جاتے۔ "سات بجے سے پہلے چھٹی ملنی مشکل ہے" رما کانت

نے سوچا، اور اس کا منھ لٹک گیا۔

گھر چھوڑتے وقت گومتی نے خاص کر کہا تھا "جلدی آنا، بخار بڑھتا معلوم ہو رہا ہے"

رما کانت نے ماتھا چھو کر دیکھا تو آگ ہوا جا رہا تھا۔ "لعنت ہے ایسی نوکری پر! آج میں نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں، ایسا نہ کرو۔ مہینوں دَر دَر بھٹکنے پر تو نوکری ملی ہے!..... مجھے کچھ نہیں چاہیئے، دو چار دن میں اچھی ہو جاؤں گی۔"

"گومتی،" استری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رما کانت بولے، "میں نے تمھیں کبھی سکھ نہیں دیا جب دیکھو تب ہمیں بیکاری یا بیماری گھیرے ہی رہتی ہے!"

"ہمت نہ ہارو۔ یہ دن بھی نکل جائیں گے۔ جاؤ جلدی کرو۔ آج تنخواہ بھی ملنے والی ہے۔ چلے جاؤ..... گھر کا کرایہ دینا ہے.... دودھ والا بھی چلّا رہا ہے...... اٹھو..."

گومتی کی بغل میں سویا ہوا بچّہ جاگ کر رونے لگا۔ گومتی نے اسے پچکار کر چپ کرایا اور رما کانت سے بولی: "آتے وقت منّے کے لئے ایک جھنجھنا لیتے آنا۔"

رما کانت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا — آفس کی گھڑی میں پانچ بج رہے تھے؛ 'جلدی آنا، بخار بڑھتا معلوم ہو رہا ہے' اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ صاحب سے چھٹی مانگنے کے لئے نہ

اُٹھا، مگر کچھ سوچ کر پھر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے، رما کانت؟" پاس میں بیٹھے ٹائپسٹ نے پوچھا۔ "آج تم بڑے پریشان معلوم ہو رہے ہو!"

"ہاں، یار، دیکھو نا، پانچ بجنے کو آئے اور ابھی تک اتنی ڈاک رجسٹر میں چڑھانی باقی ہی ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ یہ تو روز کا رونا ہے! سات بجے سے پہلے آج مجھے بھی چھٹی نہیں۔ دیکھو نا، اتنی چٹھیاں ٹائپ کرنی ہیں!"

"سوچ رہا تھا صاحب سے چھٹی مانگوں...... گھر پر استری نمونیا سے مر رہی ہے، اور میں یہاں ٹامس صاحب کے رجسٹروں کی گرد جھاڑ رہا ہوں۔ اور یہ سب چالیس روپلی کے لئے!"

"ارے بھائی، اسی کو تو کہتے ہیں اوندھی قسمت۔"

"اوندھی قسمت کی ایسی تیسی، میں تو جا کر چھٹی مانگتا ہوں۔ دینا ہو دیں، ورنہ استعفاء حاضر ہے۔"

رما کانت تیزی سے اُٹھا۔ اور سیدھا ٹامس صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دفتر کے تمام بابو حیرت میں آ، ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اندر سے ٹامس صاحب کی پھٹے بانس کی سی آواز سنائی دی—— وہ بگڑ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد رما کانت باہر نکلا اور اپنے ٹیبل پر پہنچ کر بڑبڑاتا ہوا

کاغذات جمانے لگا۔

"کیا ہوا، رما کانت؟" ٹائپسٹ نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"وہی جو ہونا تھا۔"

"یعنی؟"

"چھٹی نہیں ملی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ آج پھر نو بجیں گے۔ بھاڑ میں جائے ایسی نوکری۔ اور ٹامس صاحب بھی ...... کوئی مرے یا جیے، ان کی بلا سے۔"

ٹائپسٹ چپ ہو کر پھر ٹائپ کرنے لگا۔

* * *

سات بجے سوتی کوٹ کا پھٹا کالر الٹتا ہوا، رما کانت آفس سے باہر نکلا۔ بوری بندر پر ایرانی ہوٹل کے سامنے والے 'اسٹال' پر آ کر وہ رک گیا۔ روزانہ آفس آتے جاتے اس کی نگاہ ایک لیڈیز سوئٹر کوٹ پر پڑا کرتی تھی، جو اس 'اسٹال' پر سامنے ہی لٹکا کرتا تھا، اور رما کانت ہر روز سوچا کرتا تھا کہ تنخواہ ملنے پر اسے خرید کر گومتی کو دے گا۔ مگر وہ اسی خیال میں رہ گیا، اور ادھر شہر میں چلی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے گومتی کو دھر دبایا۔ کوئی آدمی کسی دوکان پر اگر کسی چیز کو اس لئے پسند کر رکھتا ہے کہ کسی موقع پر اسے خرید کر کسی کو بھینٹ کرے گا، اور جب ایسے موقع پر اسے خریدنے وہ

دوکان پر جاتا ہے، تو اکثر وہ چیز بک چکی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔
پر رما کانت نے دیکھا وہ سوئٹر کوٹ ابھی تک ویسے ہی
لٹکا ہوا ہے۔ فوراً اس نے مول کیا اور دام چکائے۔

بنڈل بغل میں دبا کر وہ جیسے ہی چلا، پاس میں فٹ پاتھ
پر ایک آدمی کھلونے بیچ رہا تھا۔۔۔۔ "آتے وقت ننھے
کے لئے جھنجھنا لیتے آنا،" گومتی نے کہا تھا۔ رما کانت
نے ایک بڑا سا جھنجھنا خرید لیا، اور سیدھا وکٹوریہ ٹرمنس
پہنچا۔ معلوم ہوا گاڑی ابھی ابھی چھوٹ چکی ہے۔ دوسری
لوکل کے لئے ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ تھرڈ کلاس پیسنجروں
کے لئے بنی ہوئی گرد سے بھری ایک بنچ پر رما کانت ٹوٹ کر
بیٹھ گیا۔

* * *

رات کو نو بجے قریب رما کانت تھانہ پہنچا۔ گھر کے
پڑوس میں ایک کتّا بُری طرح رو رہا تھا۔ رما کانت کے
پیروں تلے زمین کھسک گئی۔۔۔۔۔۔

'جلدی آنا'، بخار بڑھتا معلوم ہو رہا ہے'، وہ
ایک دم گھر کے اندر لپکا۔ بالکل اندھیرا تھا۔ کانپتے ہوئے
ہاتھوں سے اس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر
جلائی۔

دیا سلائی کی روشنی میں رما کانت نے دیکھا گومتی کی بے جان آنکھیں دروازے کی طرف آس لگائے تاک رہی تھیں، اور اس کے مردہ جسم پر پڑا بچہ پستان چوس رہا تھا ....

ٹیسو کے پھول

گلے میں ٹنگی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگاکر، سدھا نے مہا ندی کے دوسرے کنارے پر نظر دوڑائی۔

"ہاں، پتاجی،" وہ بولی "مکندی ٹھیک کہتا ہے۔ دھواں اُٹھ تو رہا ہے۔"

پنڈت گیا پرشاد نے اپنے اُڑیا باورچی مکندی کی طرف دیکھا، "کیوں رے تو تو کہتا تھا کہ گھاٹ سے چھوا دو میل ہے، پھر بستی کنارے پر ہی کیسے آگئی؟"

پتوار چلاتے ہوئے ایک بوڑھے ملاح نے، اوڑیا اور غلط ہندی کی مضحکہ خیز دالی کھچڑی میں، مکندی سے کچھ کہا۔ شہر کے بابوؤں کے ساتھ رہتے رہتے مکندی کو ہندی بہت کچھ آگئی تھی اسی لئے سدھا نے پٹنہ سے اُسے ساتھ لے لیا تھا۔ سدھا کے

اُس بہار، اُڑیسہ سفر میں وہ بڑا کام آیا تھا۔ ڈی، لٹ۔ کی ڈگری کے لیے، سدھا گاؤں گاؤں گھوم کر ہندوستانی دیہاتی گیتوں کو جمع کر رہی تھی۔ اکثر مکندی ہی اُڑیا گانوں کا ہندی میں ترجمہ کر دیا کرتا تھا۔

"نئی، مالک، یہ بستی نئی ہے" مکندی نے کہا "لکڑا کاٹنے کا کارخانہ ہے، کوئی بابو لوگ رہتا ہے یہاں۔ یہ بوڑھا بولا کہ گاؤں وہاں سے دو میل ہے"

"ہاں، ٹھیک ہے پتا جی" سدھا نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ گاؤں نہیں، کارخانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ دھواں پائپ میں سے نکل رہا ہے۔ پاس ہی بڑا بھاری ٹین کا چھپر ہے اور بازو میں شاید لکڑی کی سیالیں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک بیل بھی بندھا ہے پیڑ سے۔ .... لال رنگ کا۔"

"اگر ہو سکا تو ایک، دو دن یہیں رُک کر ذرا آرام کر لیں گے" پنڈت جی نے آنکھوں پر اخبار سے سایہ کر کے کنارے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی، للی، میں تو تنگ آگیا بترے دیہاتی گیتوں کے مارے۔ کافی تو جمع کر لئے، اور کتنا گھوموگی؟"

لگاتار پندرہ دنوں سے اُڑیسہ کے جنگلی گاؤں میں مہاندی کے کنارے گھومتے گھومتے سدھا بھی تنگ آگئی تھی۔ سارا دن مارچ

مہینہ کی دھوپ میں جگہہ جگہہ بھٹکتے پھرنا، ایک عورت کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ پنڈت جی کی نگاہ میں تو الہ آباد یونیورسٹی اُن کی لاڈلی للی سے ڈاکٹرویٹ کی قیمت ناجائز طور پر زیادہ مانگ رہی تھی۔

"بس، پتاجی، ادھر سے ہوتے ہوئے پوری نکل چلیں گے اور وہاں سے پھر واپس الہ آباد...... سال کے آخیر تک اگر مجموعہ نکل جائے تو بڑی بات ہو گی۔!"

:. پچھم کو کھسکتے ہوئے سورج کی سنہری دھوپ میں مستول کی رسیاں تھامے، سدھا جاگتا ہوا ایک خواب دیکھنے لگی۔ اُس کی عظیم کدوکاش بس اب پوری ہونے ہی کو تھی۔ ڈاکٹرویٹ ملتے ہی اُسے کہیں پر پروفیسری یقیناً مل جائے گی۔ تمام عمر کنواری رہ کر وہ اپنی زندگی ابلاؤں کی تعلیم میں صرف کر دے گی اُنہیں نسوانی آزادی کا سبق پڑھائے گی۔ مغربی تہذیب کے چھینٹے دے دے کر بھارت کی مہیلاؤں کا جمود دُور کرنا اُس کا خاص کام ہوگا۔

چھپ چھپ پتوار چلاتے ہوئے ملاح ناؤ کھیوئے چلے جا رہے تھے۔ مکندی، اپنے مالکوں کی آنکھ بچا کر، پال کی آڑ میں دبکا، بیڑی پی رہا تھا۔ مہاندی کی میل بھر چوڑی گود میں کھیلتی ہوئی پروّیا، پنڈت جی کے ہاتھوں سے آٹھ دن پرانا "امرت بازار پتریکا"، جس کے اشتہارات تک اُن کو یاد ہو گئے تھے ——

نوچ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر تنگ آکر پنڈت جی نے اخبار موڑ مار کر جیب میں ٹھونس لیا ــــ پھر کبھی وقت کاٹنے میں کام آئے گا ــــ اور سر جو اوپر اُٹھایا تو دیکھا کہ کنارہ قریب ہے۔ کنارے پر کچھ لوگ کھڑے ہیں، بغیر چشمے کے اُنھیں صاف نہیں دِکھ رہا ہے ــــ مگر پھک پھک کی آواز کافی سُنائی دے رہی ہے۔ بیشک یہ کوئی کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔

"دیکھ تو، للی، کون لوگ ہیں کنارے پر،" پنڈت جی نے کہا۔ سدھا اپنے کالج کی کلاس میں لکچر دے رہی تھی۔ چونک کر اس نے پتاجی کی طرف دیکھا ــــ اس طرح جیسے وہ اُنھیں پہچانتی ہی نہ ہو۔

"ارے، کیا سوچ رہی ہے!" پنڈت جی ہنستے ہوئے بولے: "تو نے دیکھا، کنارے پر کچھ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

سدھا کو جھٹ خیال آیا کہ وہ کلاس میں نہیں، ناؤ پر ہے۔ پھک پھک کی آواز اس کے کانوں میں بھی زوروں سے آنے لگی۔ اُس نے دیکھا پونگے سے دھواں پھکا جا رہا ہے، ریت پر تین آدمی کھڑے ناؤ کے کنارے لگنے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

"ہاں، پتاجی، کارخانے والے ہی کوئی معلوم ہوتے ہیں،" اُس نے کہا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

کمر بھر پانی میں کود، ملاحوں نے ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کھینچ کر

کنارے پر لگا گئی۔ ریت پر کھڑے ہوئے آدمیوں میں دو تو وہیں کے اُڑیا مزدور معلوم پڑے، اور تیسرا، خاکی ہاف پینٹ، قمیص پہنے، ہاتھ میں ٹوپ لٹکائے، کوئی مہذب آدمی تھا۔ جس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کو ناؤ سے سامنے نکال لینے کی ہدایت دے کر، آگے بڑھ، پنڈت جی کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے، نیچے اُتارنے لگا۔

"میرا نام کلیان چند پجاری ہے" اُس نے عاجزانہ طور کہا۔ "دُور سے میں سمجھا کہ جنگل صاحب آرہے ہیں۔ دُنیا کے اس حصّہ میں تو اُن کے سوا کبھی کوئی نہیں آتا۔"

پنڈت جی نے ہاتھ ملایا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، مسٹر پجاری، میں پنڈت گیا پرشاد ہوں اور یہ میری بیٹی، سدھا۔"

کلیان نے سدھا کو پھر سے نمسکار کیا اور اُسے بھی ہاتھ کا سہارا دے نیچے اُتارا۔ ناؤ سے اُتارتے وقت، ساڑی کچھ اوپر سرک جانے سے، سدھا کی گوری سڈول پنڈلیاں کلیان کی آنکھوں نے اچانک ہی دیکھ لیں۔

پردیس میں کسی کو اپنی زبان بولتے ہوئے سُن، سدھا کو دلی خوشی ہوئی۔

"یہ کارخانہ آپ ہی کا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا ہی سمجھئے، ویسے ہے تو میرے دوست کا۔"

کلیان نے کہا۔

"مسٹر — مسٹر — پجاری، میں آپ سے مل کر سچ مچ خوش ہوا ہوں۔ ایک عرصہ بعد آج اپنے کسی آدمی سے ملاقات ہوئی ہے! اپنے لوگ اِدھر اور رہتے ہیں کیا؟" پنڈت جی نے پوچھا

"جی نہیں، میں اور میرے دوست، بس دو ہی ہیں — اور ہاں، ہمارا نوکر، جیون۔ باقی تو یہاں سب سنتھالوں کی بستی ہے، بڑے نیک اور بہادر لوگ ہوتے ہیں۔"

وہ سب لوگ کارخانہ کی طرف چلنے لگے۔

* * *

"معاف کیجئے گا" کلیان نے کہا، "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ اس طرف کیسے آ نکلے؟"

"للی۔ ڈی لٹ۔ کے لئے ہندوستانی دیہاتی گیتوں پر تھیسس لکھ رہی ہے۔ اُسی سلسلہ میں گیتوں کو جمع کرنے نکلی ہے" پنڈت جی نے کہا، پھر مسکرا کر بولے: "اپنے ساتھ ساتھ اس بوڑھے کو بھی کھینچ لائی۔"

"گھر میں اکیلے بیٹھے رہنے سے یہاں کی سیر کیا بُری ہے، مسٹر پجاری؟"

"جی نہیں، آپ نے اچھا کیا جو ساتھ لے آئیں۔ یہاں کی

آب و ہوا بڑی موافق پائی جاتی ہے ؟"

سدھا کو اس طرح بنا کسی جھجک کے بات چیت کرتے دیکھ، کلیان کو کچھ تعجب ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ اتنی ضیا پاش دل کشی اُس نے اس سے پہلے کسی عورت میں نہیں دیکھی تھی۔ سدھا کا بڑا بھاری جوڑا ڈھیلا ہو کر کندھے پر لٹک آیا تھا اور اس کے حُسن کو دوبالا کر رہا تھا...... کتنا اچھا ہو اگر یہ لوگ کچھ دن یہیں ٹِک جائیں !

یکا یک ہنہناہٹ سُن، سدھا نے مڑ کر دیکھا۔ دور ناؤ پر سے جیسے وہ بیل سمجھی ہوئی تھی۔ کھونٹے سے بندھا ہوا، وہ گھوڑا نکلا۔ پنڈت جی سدھا کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرائے، پھر کلیان سے بولے: "آپ کو سواری کا شوق ہے معلوم ہوتا ہے۔ ؟"

"جی ہاں، ہم لوگوں کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے۔ پھر، گھوڑے کے بغیر یہاں کے جنگلوں میں کام بھی تو نہیں چلتا"، کلیان نے کہا، اور کچھ رہ کر سوچا یا: "میں سمجھتا ہوں آج آپ لوگ یہیں ٹھہر جائیں تو اچھا ہو۔ اتنی شام کو کہاں جائے گا۔"

"بڑی مہربانی آپ کی"، پنڈت جی بولے: "ہم لوگ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ اگر آپ کو کوئی خاص تکلیف نہ ہو تو دو ایک دن رہ کر ذرا تھکان دور کر لیں۔ ویسے تو بچوا جانے کا خیال تھا، مگر۔"

"نہیں، صاحب، اتنی شام کو اب بستی میں جانے کی کیا ضرورت ہے

یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، جب تک جی چاہے رہیے....
آئیے، ذرا مِل دکھاؤں، پھر گھر چلیں گے۔"

بانس کے پھاٹک سے اندر جاتے ہوئے سدھا نے دیکھا۔ پھاٹک کے اوپر لکڑی کے تختے پر لکھا ہوا تھا:

"دی مہاندی سا مِل، ریلوے کنٹریکٹر اینڈ سپلائر، پچوا،"

"یہ بھی کیا پچوا ہی کہلاتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، یہ پچوا کا ہی ٹولہ ہے۔ بستی ویسے تقریباً ڈیڑھ میل دور ہے۔ کل لے چلیں گے۔ آپ کو وہاں"

مِل کے مزدوروں نے نئے مہمانوں کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر استقبال کیا ـــــ شاید یہ تہذیب انھیں کلیان کی سکھائی ہوئی تھی کلیان اُن لوگوں کو ایک ایک کر کے مِل کی سب چیزیں دکھانے لگا۔ چالیس ہارس پاور کے کروسل کروڈ آئیل انجن کے زور پر ہر طرف چھر چھر آرے چل رہے تھے۔ بڑی بڑی سیالیں چیری جا رہی تھیں۔ لکڑی کا بھوسہ جدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں پُر نم بھوسے کی بھینی مہک رلی تھی۔ کلیان اپنے مہمانوں کو مشینوں کی خاصیت اور سال، ساگون، شیشم وغیرہ مقامی لکڑیوں کے الگ الگ استعمال سمجھانے لگا۔ جنگل سے توڑی ہوئی لاکھ کا ڈھیر بھی پاس ہی کے ایک چھپّر میں لگا تھا۔ جنگلوں اور مشینوں کے بارے میں کلیان کا علم اور اُس کی تجارتی قابلیت دیکھ کر سدھا بہت متاثر ہوئی۔ وہ جانتی تھی

کہ واپس گھر پہنچنے پر، جب کبھی وہ اپنے اس سیر کا خیال کرے گی، خاکی ہاف پینٹ، قمیص پہنے، مہاندی ساحل کا چلانے والا، اس کی آنکھوں کے آگے سب سے پہلے نظر آیا کرے گا۔ آدمی آدمی میں بھی کتنا فرق ہوتا ہے! کہاں تو وہ ـــــ ڈاکٹر مس سدھا پرشاد، ایم۔اے، ڈی۔لٹ ـــــ اُترپردیش کے کسی کالج میں اپنی طالبات کو علم کی روشنی بخشتی ہوگی، اور کہاں یہ نوجوان مہاندی کے جنگلوں میں لکڑا پھاڑتا ہوگا!

"گھر سے اتنی دور جنگلوں میں آپ کا جی نہیں گھبراتا، مسٹر پجاری؟" سدھا نے پوچھا۔

"کلیاں مسکرایا" "آدمی جہاں رہنے لگتا ہے وہیں اس کا گھر ہو جاتا ہے،" اس نے کہا۔ "یہ تو عادت کی بات ہے۔"

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، مسٹر پجاری؟" پنڈت جی نے پوچھا

"وطن تو میرا بانکی پور پٹنہ ہے، مگر بس ویسے ساری عمر الہ آباد میں رہا ہوں۔"

"الہ آباد؟" سدھا نے پوچھا۔

"جی۔"

"ہم لوگ بھی وہیں رہتے ہیں،"

پنڈت جی نے کہا۔ "اور آپ کے دوست؟ کیا نام بتایا

اُن کا آپ نے ؟"

"ہاں، آپ کے دوست نہیں دکھائی دیئے ؟" سدھا بولی۔

"جی، وہ گھر پر ہیں۔ کارخانے پر وہ بہت کم آتے ہیں۔ وہ بھی الہ آباد ہی کے ہیں۔"

"کتنی عجیب بات! سب الہ آباد ہی کے نکلے!"

"جی ہاں، دُنیا بہت چھوٹی ہے، پنڈت جی۔ چلئے، اب چلیں، مل بھی اب بند ہو گی۔ کتنا بجا ہے آپ کی گھڑی میں مس ــــــ پرشاد ؟"

سدھا نے رِسٹ واچ دیکھی "سوا چھ،" اس نے کہا:

دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی دیکھ کر کلیاں ہنسنے لگا۔ "لیجئے ہماری گھڑی پچیس منٹ پیچھے ہے۔ سچ پوچھیئے تو ہمیں گھڑی کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی سلامت رہیں ہمارے سورج اور تارے!" پھر، اپنے ہاتھوں سے گھڑی ٹھیک کر، اُس نے اپنے نوکر، جیون، کو آواز دی، جو فوراً حاضر ہوا۔ اُسے مل کے بارے میں سارا کام سمجھا کر اور سامان لے مادھوی کنج کا بھیجنے کی ہدایت دے، مہمانوں کو ساتھ لئے وہ باہر نکلا۔ جہاں تکندی اور ایک اُڑیا نوکر گھوڑے کو لئے کھڑے تھے۔ وہ لوگ سب کارخانے کی دکھن سمت چل پڑے۔

سورج چھپ چکا تھا، لیکن اتنی روشنی ابھی باقی تھی کہ بڑے بڑے

سال درختوں کے بیچ سے جاتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی انھیں دکھلائی دے۔

"جنگل تو بڑا گھنا ہے مسٹر پجاری، یہاں جانوروں کا ڈر نہیں ؟" سدھا نے پوچھا۔

"جانور ہیں تو، مگر ادھر نہیں۔ ذرا اندر کی طرف ملیں گے۔ ابھی پچھلے جاڑوں میں ہی تو روہت نے ایک شیر مارا تھا۔"

"کون روہت ؟" سدھا نے پوچھا۔

"میرے دوست۔ بڑے اچھے شکاری ہیں۔ ابھی تک ہم لوگ تین شیر مار چکے ہیں ـــــ چار سال کے اندر۔"

لگ بھگ تین فرلانگ چلنے کے بعد، سدھا کو دور ٹیلے پر ایک چھوٹا سا گھر دکھائی پڑا۔ پاس پہنچنے پر اس نے دیکھا گھر کے آس پاس بڑے بڑے پیڑ لگے ہوئے ہیں۔ سامنے بانس کے احاطہ کے اندر چھوٹا سا باغ ہے۔ جس میں قسم قسم کے پھل، پھول لگے ہوئے ہیں، جن کی پہچان شام کے دھندلکے میں وہ نہ کر سکی، پاس ہی دو ہرن گھانس چر رہے ہیں، اوپر، پیڑوں میں، کہیں مور بول رہا ہے۔ ایسا دلکش مقام دیکھ کر سدھا کو لگا ـ جیسے وہ، آج سے ہزار برس پہلے، کسی آشرم کے چمن میں چہل قدمی کر رہی ہے۔ نہ جانے کیوں، پر اسے جان پڑا کہ وہ اس جگہ سے مدت سے واقف ہے۔

"مادھوی پھولی ہے شاید؟" پنڈت گیا پرشاد نے پوچھا۔
"جی ہاں، ہمارے گھر کا نام 'مادھوی کنج' ہے، پنڈت جی۔ رو ہت کو پھولوں کا بڑا شوق ہے۔ یہ سارا باغ اسی کا لگایا ہوا ہے۔"

پھاٹک کی آواز سُن کر گھر کے اندر سے چھوٹے قد کا ایک بوڑھا سنتھال باہر آیا اور جھک کر سب کو پرنام کر کھڑا ہو گیا۔ کلیان نے اُس سے کہا کہ مہمانوں کے ساتھ آئے ہوئے نوکر کو وہ اپنی کوٹھری پر لے جائے اور اس کے کھانے پینے کا انتظام کرے۔ سب نوکر باغ میں سے ہو کر مکان کے پیچھے کی طرف چلے گئے۔

"بڑی ہی بھلی جگہ ہے!" سدھا نے برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

کلیان نے بیٹھنے کے لئے اُنھیں کرسیاں دیں۔ "معاف کیجیئے گا، ہمارے پاس فرنیچر وغیرہ کوئی خاص ہے نہیں۔ بس یہی دو ایک ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ ہم لوگ تو یہاں بالکل سادہ ڈھنگ پر رہتے ہیں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کیجیئے، مسٹر پجاری۔ ہم لوگ بڑے مزے میں ہیں"، سدھا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے!" پنڈت جی بولے۔ "جی چاہتا ہے یہاں سے کبھی نہ جائیں۔"

کلیان ہنسنے لگا۔ "تو آپ کو جانے کے لئے کون کہتا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "شوق سے رہیئے۔ گھر آپ کا ہے ... لیکن یہاں کے جنگلوں میں مس پرشاد کو ڈاکٹر وہیٹ نہیں مِل سکتی۔"

سدھا اور پنڈت جی بھی ہنس پڑے۔

اِتنے میں کارخانے کے دو اُڑیا مزدور سامان لئے آ پہنچے اور اندر رکھ گئے۔

"آپ لوگ نہائے گا؟ پانی نکلواؤں؟" کلیان نے پوچھا۔

"جی ہاں، ضرور، اِخیر نہائے تھکاوٹ دور نہیں ہوگی،" پنڈت جی نے جواب دیا۔

سدھا نے سوٹ کیس کھول کر۔ پنڈت جی کے کپڑے نکال دیئے اور کلیان اُنھیں غسل خانہ تک پہونچا آیا۔

"آئیے، مس سدھا،" اس نے کہا "آپ کو گھر دکھاؤں۔"

⁂ ⁂ ⁂

گھر بالکل نرالے ڈھنگ کا تھا۔ دیواریں پتھر، مٹی اور کہیں کہیں لکڑی کی تھیں۔ بیچ کے کمرے میں زمین پر بڑی بھاری دری بچھی تھی۔ اُس پر سفید غلاف والا، موٹا گدّا، کچھ گاؤ تکیے اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ داہنے بازو کی دیوار پر شیر کا چمڑا ٹنگا تھا۔ اور دوسری دیواروں پر نندلال بوس اور مجمدار کے تین، چار فوٹو ریشم کی لمبی لمبی ڈوریوں سے لٹک رہی تھیں، کونے میں، جنگلی بھینسے کے سینگوں سے ایک بندوق ٹنگی تھی۔ بازو کا کمرہ شاید سونے کے لئے تھا۔ یہاں پر

دو پلنگ بچھے تھے، جن کے نیچے کچھ صندوقیں پڑی تھیں - ایک تپائی پر پانی کی صراحی اور کانسے کا گلاس رکھا ہوا تھا - پاس ہی، بغیر وارنش کئے ہوئے فولڈنگ ٹیبل پر، لکھنے پڑھنے کا کچھ سامان تھا - اور فرش پر ڈھیر سے لکھے ہوئے کاغذات پڑے ہوئے تھے - تیسرے کمرے کو کلیان کا آفس کہہ سکتے ہیں - ہندوستان کا پھٹا ہوا نقشہ، پرانا ایک پورٹ ایبل ٹائپ رائٹر اور الماریوں میں فائلوں کا ڈھیر اس کے خاص سامان تھے - اس سے لگی ہوئی کوٹھری میں کچھ فالتو سامان تھا - مگر پچھم والا کمرہ ایک عجیب چیز تھا - فرش پر قیمتی مگر پرانا مخملی قالین بچھا تھا، جس پر بہت سے پھول دھرے ہوئے تھے - بازو میں خوبصورت سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا - کاغذات یہاں بھی بکھرے ہوئے تھے - دیواروں سے لگی ہوئی الماریوں میں ہندی اور انگریزی کی لگ بھگ ہزار کتابیں تتر بتر رکھی تھیں کھونٹی سے ایک چوڑی دار پائجامہ لٹک رہا تھا - کھڑکیوں میں پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں جھول رہی تھیں اور کونے میں گرد سے بھری ایک وینا ٹکی ہوئی تھی -

"وینا آپ بجاتے ہیں؟" سدھا نے بڑے شوق سے اچھا اور اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگی -

"جی نہیں، یہ رودہت کی ہے کبھی اُسے اس کا بڑا شوق تھا" سدھا کے من نے کہا، اس وینا کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے - "پھر شوق جاتا کیوں رہا؟" اُس نے پوچھا -

"اوں، لہری آدمی جو ٹھہرا۔ پھر، اُس کے کوئی ایک شوق تھوڑے ہی ہے۔"

سدھا نے وینا پر کی گرد پھونک کر اُڑائی اور اُسے واپس رکھتی ہوئی بولی۔ "بڑا اچھا باجا ہے۔"

"جی ہاں، آپ کو بھی شاید اس کا شوق معلوم ہوتا ہے؟"

"یوں ہی، تھوڑا سا۔"

اِس کے بعد کلیان اور سدھا نے پیچھے کی چھپری، غسل خانہ، باورچی خانہ، نوکروں کی کوٹھریاں، اصطبل کی طرف ہوتے ہوئے سامنے کے برآمدے میں آ بیٹھے۔

"آپ الہ آباد کب سے نہیں گئے، مسٹر پجاری؟" سدھا نے پوچھا۔

"چار سال ہوئے گیا تھا ——— روہت کے پاس۔"

"آپ کے دوست شاید مصنّف ہیں"

"کوی۔"

"کون کوی ہے؟"

گیلا تولیہ کندھے پر ڈالے، باہر نکلتے ہوئے پنڈت جی نے پوچھا۔

"مسٹر پجاری کے دوست،" سدھا نے بتلایا۔

"ہاں، بھئی، آپ کے دوست سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ گھر پر نہیں ہیں کیا؟"

"شاید نہانے گیا ہوگا ندی پر۔ اتنے میں بس آتا ہی ہوگا"
کلیاں نے کہا۔

"اچھا لکھتے ہیں؟" سدہا نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ اتنی بڑی ہستی آج ہمارے ہندی ادب میں تو دوسری نہیں دیکھنے میں آتی۔ جینس ہے۔ آپ لوگ اُس سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"کیا نام بتایا آپ نے؟" پنڈت جی نے کہا۔

"روہت، روہت ورما۔"

"اوہو! وہی تو نہیں جنھوں نے 'موں سگیت' لکھی ہے؟"
سدہا بولی۔

"جی ہاں، وہی پڑھی ہے آپ نے وہ کتاب؟"

"وہ تو میری خاص کتابوں میں سے ہے،" سدہا نے کہا "آج کل وہ ایم۔ اے۔ کے کورس میں بھی ہے۔ اس کے بعد پھر شاید مسٹر ورما نے اور کوئی کتاب نہیں لکھی؟"

"ڈھیر سی لکھی ہیں، لیکن انھیں ابھی چھپوائی نہیں۔ ان دنوں وہ ایک بلند پایہ دیوان مرتب کر رہے ہیں۔

"اچھا!..... سُنا ہے، کچھ دن مبور کالج میں وہ پروفیسر بھی تھے؟" سدھا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"پھر کیوں چھوڑ دیا؟"

کلیان مسکرایا۔ "ہندی ادب کو ایک کوی کی ضرورت تھی،" اُس نے کہا۔

سُدھا کو لگا کہ اصلی بھید اس سے چھپایا جا رہا ہے۔ اسی وقت باہر سے سیٹی کی ایک پیاری تان کانوں میں پڑی۔ اس نے حیرت سے کلیان کی طرف دیکھا "روہت آ رہا ہے" کلیان نے اشارہ کیا۔

سیٹی بجاتا ہوا، بدن پر صرف ایک گیلی دھوتی لپیٹے، اندھیرے میں سے روہت ظاہر ہوا۔ گورا چٹا بدن، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی اونچی ناک، پتلے ملے ہوئے ہونٹ۔ کلیان کی طرح اس میں بھی عجیب دل کشی تھی۔ اُس کی ننگی چھاتی اور بازوؤں پر پانی کی بڑی بڑی بوندیں چپکی ہوئی تھیں جو برآمدے میں لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی میں ایسی معلوم ہوئیں جیسے کسی نے اس کے بدن پر موتی ٹانک دیئے ہوں۔ اُس کے چوڑے ماتھے پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔

اچانک نئی صورتوں کو برآمدے میں دیکھ، روہت کچھ ٹھٹھکا۔ کلیان نے اس کا اُن سے تعارف کرایا اور بتلانے لگا کہ شام کو اتفاقاً اُن سے کس طرح ملاقات ہو گئی۔

اپنے آدھے ننگے جسم کو لئے، بنا کسی خیال کے، روہت نے نمسکار کیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر،" پنڈت جی بولے "ابھی آپ ہی کی تعریف ہو رہی تھی۔"

"ایسی تو کوئی غلطی میں نے نہیں کی،" روہت نے سادگی کے ساتھ کہا۔

سب لوگ ہنس پڑے۔ کپور کلیان نے اپنے دوست کو بتلایا کہ سدھا ڈاکٹریٹ کی تھیسیس کے لئے دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کے لئے نکلی ہے۔ اور اُس کی (مون سنگیت) بھی وہ پڑھ چکی ہے۔

"جی ہاں،" سدھا نے کہا "مجھے آپ کی وہ کتاب بہت پسند ہے۔ یہاں تک کہ میں اُسے اپنے ساتھ یہاں بھی لائی ہوں۔ آپ کی کویتاؤں میں تصویر کی دل کشی اور حقیقت کی چاشنی تو بس کمال کی ہے! مگر اب تو یہاں آپ کی دوسری تصنیفات بھی دیکھنا نصیب ہوں گی۔"

"مون سنگیت" کے مصنف کو سدھا سے اپنے کمالِ فن کی داد سُن کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ "نقش و نگار کی صداقت اور احساس کی آگہی"۔۔۔۔ اوہ! رانی جی تو اس کی کویتا سمجھنے کا دم بھرتی ہیں! اب تو مینڈکیوں کو بھی زکام ہونے لگا۔!

"میں آپ کو صلاح نہیں دوں گا کہ آپ اپنا وقت برباد کریں" اُس نے کہا۔

"اچھا، اب تم اندر جا کر کپڑے وپڑے بدلو" کلیان مسکراتا ہوا بولا، "ورنہ تمھارے اس حلیہ کو دیکھ کر ——"

"اوہو! میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ـــــ" روہت نے سدھا کی طرف دیکھ کر طنزیہ کہا، "کہ میں ایک ترقی یافتہ لیڈی کے سامنے کھڑا ہوں ۔ جنگلوں میں رہتے رہتے شہروں کی تہذیب کچھ بھول سی گئی ہے ۔ بھئی، معاف کیجئے گا ۔ کیا کہوں آپ کو؟ کیسے مخاطب کروں؟ 'سدھا دیوی' یا 'مِس سدھا' ؟"

سدھا مسکرائی "جیسے جی میں آئے،" اس نے کہا ۔

"تو 'سدھا دیوی' کہوں گا ..... نہیں، 'مِس سدھا' ہی اچھا ہے ۔ ہائی ہیلز شوز کے ساتھ 'مِس' ہی خوب جچتا ہے کیوں صاحب؟"

پنڈت جی قہقہہ مار کر ہنس پڑے ۔ "بھئی 'للی' ۔ بات تو سچ ہے ۔ انھوں نے کہا ۔

روہت نے سر کو جھٹکا دیا اور بالوں سے چھینٹے اڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

روہت کی گفتگو سے سدھا کو دکھ پہنچا ' دیکھ کلیان نے کہا:

"برا نہ مانیے گا، مس سدھا ۔ اس کی عادت ہی ہے کچھ اول جلول بول دینے کی ۔

"ہمارا یہاں آنا شاید مسٹر ورما کو ٹھیک نہیں لگا" سدھا بولی ۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ۔ بڑا لہری آدمی ہے ۔ اسے سمجھنے میں آپ کو وقت لگے گا ..... جائیے، اب آپ نہانے جائیے ۔"

* * *

سدہا ہر روز کلیان کے ساتھ بیل گاڑی پر سوار ہو، چچوا، لومچی، بنجھا وغیرہ آس پاس کے گاؤں میں گھوم کر دیہاتی گیت جمع کرنے لگی۔ سدہا نے دیکھا "مادھوی کنج" میں، وہاں کے چرندوں میں، وہاں کے لوگوں میں، وہاں کی تھاہ میں کوئی جاذب اثر تھا، چاروں طرف امن کی فضا تھی۔ جدھر اُدھر کویتا بکھری پڑی تھی شہر کا۔ ترقی یافتہ شہروں کا ــــ چال وچلن، خود غرض زندگی، وہاں کی حیلہ بازی، وہاں کی کشمکش، وہاں کی ہائے ہائے مہاندی کے جنگلوں میں بسے ہوئے اس "مادھوی کنج" کے اندر باہر ذرا سی بھی اس قسم کی جھلک نہ تھی۔

پنڈت جی بھی صبح شام روہت کے ساتھ بیٹھ، ادبی اور اخلاقی گفتگو میں اپنی تھکان دور کرنے لگے۔ دوپہر کو جب روہت پاس میں بہتی ہوئی ندی کے کنارے جا، گھنی جھاڑیوں سے گھرے خودرو درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر، اپنے بلند پایہ دیوان کے مرتب کرنے میں کھو جاتا، تب پنڈت جی "مادھوی کنج" کے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر ٹانگ پھیلا کر، تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ اُن کا باقی وقت باغ کی مرمت اور کارخانے کے دو ایک چکروں میں بڑی آسانی سے گذر جاتا۔ کبھی کبھی ہرنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہری دوب کھلاتے کھلاتے، یا باغ کے پودوں کی سوکھی گلی پتیوں کو قینچی سے کاٹتے ہوئے، اُن کا جی کرتا کہ وہ یہیں رہ جائیں۔

للی بھی فضول ڈاکٹر وبیٹ کے جھگڑوں میں پڑ کر اپنی زندگی خراب کر رہی ہے۔ اُسے تو چاہیئے کہ وہ کلیان یا روہت سے شادی کرکے اب یہیں بس جائے۔ روہت اور کلیان کے ساتھ گزارے ہوئے ان چار، چھ دنوں نے تو اُن کے خیالات ہی بدل دیئے! زندگی کا مقصد، زندگی کا تقاضا، کچھ اور ہی محسوس ہونے لگا۔ ..... انھوں نے دل ہی دل مہا ندی کے گھاٹ پر ہی اپنی چتا جلانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

کلیان کے ساتھ بیل گاڑی میں گاؤں گاؤں گھومتے ہوئے، سدہا نے محسوس کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ سدہا کا کلیان کی زندگی سے واقف ہونا، رُوہت کی زندگی سے بھی واقف ہونا تھا، کیونکہ دونوں بچپن سے دو دل ایک جان ہو کر رہے ہیں دونوں کالج میں بھی ساتھ تھے۔ روہت نے ایک وقت، اپنی جان خطرے میں ڈال، کلیان کو گنگاجی کے بھنور سے بچایا تھا۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد روہت میور کالج میں پروفیسر ہو گیا، اور کلیان، وکالت کر کے، اپنی دادی کے پاس پٹنہ چلا آیا اور وہیں پر وکالت کرنے لگا۔ دونوں کے ماں باپ کوچ کر چکے تھے۔ سال بھر کے بعد کلیان کی دادی بھی چل بسی۔ دادی کے مرجانے کے بعد اُس نے روہت کے پاس جاکر الہ آباد میں ہی پریکٹس شروع کر دی۔ مگر اسی درمیان سرلا نے روہت سے بے وفائی کی —— اس نے اپنی صورت پر تجارت

کرنی چاہی - مس سرلا ڈیسائی الہ آباد میں لیڈی ڈاکٹر تھی - روہت یہ چوٹ نہ برداشت کر سکا - آخر کار اسی تکلیف سے بے چین ہو کر اُس نے استعفاء دے دیا - زندگی سے وہ بیزار سا ہو گیا - جہاں جہاں روہت جاتا، اس کی چھایا، کلیان، کو بھی یقیناً جانا ہوتا - مہاندی کے کنارے آکر اُس نے (مادھوی کنج) کی بنیاد ڈال - پاس کے دس ہزار روپیئے اُس نے کلیان کو سونپ دیئے - اس طرح "ندی مہاندی سامل" کی بنیاد پڑی - دونوں دوست محبت کی مضبوط نہ ٹوٹنے والی رسی میں بندھے ہوئے ہیں، ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں -

روہت کے تمام کارناموں میں کلیان کا بہت سا ہاتھ ہے - اسی نے روہت کو لکھنے پر مجبور کیا، اُسے دلاسا دیا، شعر و سخن کا ماحول پیدا کر اُسے متاثر کرایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "شاپ"، "پیرل گان"، "پتنگے کی لاش"، "پاشان کے پھپھولے"، اور دیگر مجموعے مرتب ہوئے۔

سدھا نے ایک دن روہت کی کویتا کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کلیان سے کہا: "ان مجموعوں کو آپ نے ابھی تک چھپوایا کیوں نہیں ؟ میں دیکھتی ہوں کہ آج کی ہندی کویتا سے روہت کی کویتا بالکل نرالی ہے - میرے خیال میں تو اُن کے "پیرل گان" اور "پاشان کے پھپھولے" بہت ہی اونچے درجہ کی کویتائیں ہیں - دیکھئے چھپتے ہی ہندی دنیا میں دھوم مچا دیں گی"

"میں نے تو کئی مرتبہ چاہا کہ اُنھیں چھپواؤں"، کلیان بولا:

"مگر روہت نے منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

"اُس کی لہر۔ شاید وہ نہیں چاہتا کہ اپنی آہ بھری کویتا سے دنیا کا دل بہلائے۔"

"کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں؟"

"آپ جانتی ہیں۔ اُس کے دل پر زخم لگا ہے۔ جب تک وہ بھرتا نہیں، میں سمجھتا ہوں، ایسی غلطی کے لئے اُسے معاف کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ کیوں نہیں کوئی ترکیب کرتے کہ زخم جلدی بھر جائے؟"

"میں؟ مشیت ایزدی کے آگے بھلا کیا ترکیب کر سکتا ہوں!"

"سدہا کو تعجب ہوا۔ "آپ مشیت ایزدی پر اعتماد رکھتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں ہر چیز میں اعتماد رکھتا ہوں" کلیان نے جواب دیا۔

کلیان اور روہت کے متعلق سدہا کے دل میں جستجو پیدا ہونے لگی۔ اُن کی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی وہ کوشش کرنے لگی۔ دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا خیال اس کے دل سے دھیرے دھیرے اُچٹنے لگا، اور وہ اب "مادھوی کنج" ہی میں رہ کر، کلیان اور روہت کے آس پاس منڈلانے لگی۔ باہر کی طرف سے اچانک یہ دو آدمی آکر "مادھوی کنج" میں کیسے گھل مل گئے، اس پر غور کرنے کا کسی کا موقع ہی نہیں ملا۔ دن بیتنے لگے اور کسی کو اس کا ہوش تک

نہ ہوا۔

اکثر شام کے وقت، جب سدھا مہاندی کے کنارے بیٹھ، پیر نیچے لٹکا کر۔ اُن سے پانی اُچھالتی، تھرکتی ہوئی ندی کے لہراتے ہوئے یاقوتی لبوں کو چوم کر، جب سورج، مست ہو کر، نیچے کی طرف ڈھلک پڑتا، جنگل سے اُٹھتی ہوئی ہوائیں جب اپنا معطر دامن جھٹکتی ہوئی اُٹھلا اٹھلا کر چلنے لگتیں، پاس ہی بیٹھا ہوا کلیان اچانک چُپ ہو کر بہت دور آسمان میں اکیلے بھٹکتے ہوئے کسی بادل کے ٹکڑے کو دیکھنے لگتا، تب سدھا سمجھ جاتی کہ اس کے دل کے نازک تاروں پر کوئی انوکھی راگنی بج رہی ہے۔ اور ایک دن، ایسے ہی وقت پر، کچھ وہ چونک پڑی۔ اس نے سوچا وہ اپنا دل کہیں کھو بیٹھی ہے۔ کب، کس طرح، اُسے یاد نہیں۔ بے چین ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں۔ اُس نے کلیان کی طرف پھرائیں۔ دیکھا کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں آج خاص طور سے چمک رہی ہیں۔ سدھا کا ہاتھ۔ دھیرے سے اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس نے کہا: "سدھا! ....." کلیان کی پیشانی پر باریک باریک لکیریں اُبھر آئیں، اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ "سدھا!" اُس نے کہا۔ سدھا کے دل میں کسک اُٹھنے لگی —— ویسی نہیں جیسی کہ ڈاکٹر دیٹ کے لئے اُٹھا کرتی تھی۔ "کلیان،" اس نے کہا، "کلیان!" کلیان نے سدھا کا ہاتھ

اُٹھا کر چوم لیا۔ سدہا نے اپنا سر کلیان کی چھاتی سے لگا دیا۔ دونوں، اس مدہوشی کے عالم میں، مہاندی کے گھاٹ پر بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ سدہا کی محبت نے کلیان کی زندگی کو مکمل کر دیا۔ کلیان سے محبت کی چھینٹیں پاکر سدہا کے دل میں چھپی ہوئی محبت کی لو یکایک تیز ہو اُٹھی۔ اس نے محسوس کیا اب وہ الہ آباد واپس نہیں لوٹ سکتی۔ کلیان کے بنا، کلیان کو چھوڑ، کلیان سے دور، وہ نہیں رہ سکتی۔ کلیان!.... نہ جانے کیوں، لیکن کلیان کا خیال کرتے ہی اس کے آگے ایک اور تصویر آ کھڑی ہوتی ہے —— پہچانی سی، بہت پہچانی سی۔ اور پھر، اس خیال سے آگے بڑھ کر، وہ ساری جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پھر، کلیان کا کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ بس وہی ایک تصویر ہوتی ہے۔ پہچانی سی، بہت پہچانی سی۔ چوڑے ماتھے پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوتا، بدن پر گیلی دھوتی لپٹی ہوتی، اور جسم پر موتی ٹنکے ہوتے "کیا کہوں آپ کو؟ کیسے، مخاطب کروں؟" وہ تصویر کہا کرتی۔ "سدہا دلوی یا مس سدہا؟" ..... اوہ! یہ تو کلیان ہی کا سایہ ہے —— روہت۔ ہاں، روہت۔ مگر روہت اُس سے اتنا دور دور کیوں رہتا ہے؟ کیوں اُس سے بے رُخی سے ملتا ہے؟ مانا کہ کسی نے اس کا دل دکھایا ہے لیکن کیا سبھی عورتیں ویسی ہی

ہوتی ہیں ؟ —— بے شرم، دھوکا دینے والی ؟ کتنی نفرت کرتا ہے وہ عورتوں سے ! اُس دن، عورتوں کے متعلق بحث کرتا کرتا، کتنی آگ اُگلی تھی اس نے !

"یہ سب نکمّی تعلیم ہے جو انھیں دی جاتی ہے" اُس نے کہا تھا تب سدھا کو بھی جوش آگیا تھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں کہ عورتوں کو چار دیواری کے اندر قید رکھ کر اُنھیں آدمیوں کے دل بہلا دے کا کھلونا بنایا جائے ؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"جی نہیں، مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ عورتیں ٹائپسٹ اور اکاؤنٹنٹس بن کر خانہ داری کو آگ لگا دیں۔ بہترین بیوی یا ماں بننے سے پاپولر لیڈی ڈاکٹر بننا بہت آسان ہے۔ مس پرشاد"

"کیا اُنھیں اونچی تعلیم دے کر قابل بنانا گناہ ہے ؟"

"کون سی تعلیم ؟" روہت نے جوش میں آکر کہا تھا۔ "کون سی تعلیم ؟ آپ اُنھیں کس قابل بنانا چاہتی ہیں ؟ 'اونچی تعلیم' اور 'عورتوں کی آزادی' کی آڑ میں اُن کی ماں کی ممتا کو برباد کرنا، اُنھیں قابل بنانا ہے۔ ایسا میں نہیں سمجھتا۔ جب تک آپ کی یونیورسٹیوں سے لڑکیاں گریجویٹ ہو کر باہر نکلتی ہیں، آپ دیکھیں گی، عورت کے سارے نشانات کافور ہو جاتے ہیں۔ نہ اُن میں کوئی اچھائی باقی رہتی ہے نہ جاذبیت۔ ڈھنسی ہوئی آنکھیں، پچکی ہوئی چھاتیاں اور بگڑے ہوئے خیالات —— یہی ان کی

خصوصیات ہوتی ہیں۔" پھر، سدھا کی طرف ایک غائر نظر سے دیکھ کر، اُس نے چھینٹے دیئے تھے: آپ جیسی ایک آدھ معصوم ممکن ہے مل جائیں گی۔ لیکن، عام طور پر میرے کہنے کا آپ کو یقین ہی کرنا ہوگا۔"

تب پتاجی نے بھی، زوروں سے سر ہلا کر، روہت کا ساتھ دیا تھا۔ بحث میں اپنی ہار ماننے کے لیے سدھا تیار نہیں تھی لیکن کلیان سے آنکھوں کا اشارہ پا کر وہ چپ ہو گئی تھی۔ یہ کلیان بھی تو روہت سے متفق تھا۔ کئی باتوں میں دونوں بالکل ایک سے ہیں۔ ایک دوسرے کا چھایا ہیں یہ دونوں —— روہت اور کلیان، کلیان اور روہت، روہت، روہت، روہت ... کیا مشیتِ ایزدی کا یہ بھی کوئی بھید ہے جو روہت کی تصویر ہر دم اس کا پیچھا کیے جاتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ روہت سے محبت —— نا، وہ تو کلیان کی ہے۔ کلیان کی ہی ہے۔ کلیان کے سوا اس کا اور کوئی نہیں۔ بھلا دوسرا اور کوئی اس کا ہو سکتا ہے؟ ہاں، ایک اور کوئی دھندلی سی صورت دکھلائی تو پڑ رہی ہے —— کون ہے یہ؟ شاید پتا جی ہیں۔ لیکن —— لیکن وہ کس کی تصویر اتنی جلدی بڑھتی چلی آ رہی ہے؟۔ موتیوں سے ٹنکا ہوا یہ کس کا جسم ہے؟ ارے، یہ تو وہی ——

"سدھا" کلیاں نے آہستہ سے پکارا۔

سدھا کے خیالی سپنے ٹوٹے۔ اُس نے دیکھا مہاندی کے ریت پر، کلیان کی چھاتی سے لپٹی ہوئی، وہ بیٹھی ہے۔ آسمان میں بکھرے ہوئے رنگ گم ہو چکے ہیں۔ کلیان کی چھاتی کے اندر سے دل کی دھڑکن صاف سُنائی دے رہی ہے "کیا سوچ رہی ہو؟" کلیان اُس سے پوچھ رہا ہے۔ "کہاں ہو سدھا؟"

سدھا کچھ چونک سی گئی "یہیں تو ہوں، کلیان" اُس نے کہا، "یہیں . . . . . . تمھارے پاس۔"

* * *

"مادھوی کنج" کے اندر دھیرے دھیرے سدھا نے ایک انوکھی جگہ حاصل کر لی، گھر کے کام کاج میں وہ بالکل کھنچ سی گئی۔ پنڈت جی کو جب کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ ادھر اُدھر نہ بھٹکتے سیدھے سدھا کے پاس جاتے۔ کلیان نے بھی اپنی ضروریات کا سارا بوجھ اُسی پر ڈال دیا۔ نوکر چاکر اُسی سے پوچھ کر گھوڑوں کو دانہ پانی دیتے اور اُسی سے چھٹی مانگ کر گھر جاتے۔ روہت بھی سدھا کی طرف سے زیادہ دنوں تک آنکھیں بند نہ رکھ سکا۔ اپنے کمرے کی صفائی، اپنی کویتا کے بکھرے پرچوں کی دیکھ بھال، اور صبح کے دودھ کے گلاس کے لئے وہ ایک طرف سے سدھا پر ہی یقین رکھنے لگا۔ کبھی کبھی سدھا کی کسی بھول کے لئے اس سے جواب بھی

طلب کیا جاتا! . . . .

سدھا نے محسوس کیا کہ اب وہ مہمان نہیں رہی ہے۔ اب وہ "مادھوی کنج" میں بسیرا لینے والوں کی زندگی کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے، اب وہ گھر کی مالکن بنی بیٹھی ہے۔ ڈی۔ لٹ۔ لینے کا خیال اور پروفیسر ہونے کی بہت بڑی اُمید اب اُس کے دل میں ایک دم سکڑ سکڑا کر مٹی جا رہی ہے۔ (مادھوی کنج) کے رنگین، کو بتا بیں دل خوش کن حالات میں وہ بالکل کھوسی گئی ہے۔ یہاں پر اپنی دنیا آباد کرنے کا ارادہ اس کے دل میں مضبوطی سے جم گیا ہے۔ مگر پھر بھی، رہ رہ کر اُس کے دل میں کچھ ہلچل سی مچا کرتی ہے۔ اُسے اپنی زندگی میں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ صرف اس کا کلیان اور اُس کے پتاجی اس کی زندگی کو مکمل بنانے کی کوشش میں ہیں۔ روہت کے لئے —— "موہن سنگیت" کے بنانے والے روہت کے لئے —— اس کے دل میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ "پتنگے کی لاش"، "پرل گان"، اور "پاشان کے پھپھولے"، کی بلند خیالی حاصل کرنے کے لئے، اُس اونچی جگہ تک پہنچنے کے لئے اُس کا دل بے چین ہو اُٹھا۔

امربیل جیسی پھولوں کی خوشبو سے مہکتا ہوا دوپہری کا بالکل سنّاٹا اور کسی اونچی جگہ سے آتی ہوئی کوئل کی مدھر کوک سدھا کے دل کو تلملا دیتی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے ہوا کا ہر جھونکا کوئل

گی ہر کوک ندی کے کنارے والی گھنی جھاڑی سے اُس کے لئے کوئی پیام لا رہی .... اور تب وہ "مادھوی کنج" سے نکل کر ندی کی طرف چل پڑتی - گھنی جھاڑیوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے روہت کو سدھا کا آنا کھٹک جاتا - اُس کی چلبلاہٹ، بھاگتے ہوئے ہرنوں کے پیچھے اس کا دوڑنا، تالی بجا بجا کر موروں کو نچانا، کسی نہ کسی بہانے بحث اور چھیڑ چھاڑ کرنے کی اُس کی کوشش روہت کے لکھنے میں خلل پیدا کئے بغیر نہ رہتی -

"دیکھو، سدھا، تم یہاں نہ آیا کرو" وہ کہتا "یہ جگہ تمھارے لئے نہیں ہے"

"کیوں نہ آؤں ؟ واہ ! کیا اُس جگہ کا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے ؟"

"تم گھر پر ہی رہا کرو - اگر آتی ہو، تو چپ بیٹھو - تمھاری گڑبڑ میں مجھ سے لکھا نہیں جاتا"

"دیکھوں کیا لکھا ہے" سدھا کہتی اور روہت کے ہاتھ سے کاغذوں کے پوٹل چھین لیتی - جب تک وہ پڑھتی ہوتی، روہت اس کے چہرے پر آتے ہوئے نشانات کو غور سے دیکھا کرتا - "جانے دو، تم نہیں سمجھوگی" وہ کہتا "کاغذ مجھے دو"

کبھی کبھی کسی خاص کویتا کا معنی سمجھانے کے لئے سدھا اُسے مجبور کرتی - روہت سمجھاتا - سدھا خاموش ہو جاتی "غضب ڈھاتے ہو - !" وہ کہتی - "تخیلات کی پرواز نے تو کمال کر دیا ! ... لیکن

کہیں کہیں تمہارے خیالات میں زندگی کی اُلجھن سے اُداسی برستی ہے۔ تم ہمیشہ ارمانوں کو موت سے کیوں تشبیہات دیا کرتے ہو؟"۔ روہت کے ہونٹوں پر کچھ مسکراہٹ ہوتی "مجھے تمہاری رائے کی ضرورت نہیں" وہ جھڑک دیتا۔ "میں تمہارے لئے نہیں لکھتا ہوں۔ اور نہ تم میری شاعری کو سمجھنے ہی کی کوشش کیا کرو۔"

ہزار بار روہت سے جھڑکیاں کھانے پر بھی، بار بار دھتکار ملنے پر بھی، اُس کے لئے سدھا کے دل میں بے چینی کم نہیں ہوتی، بلکہ خاص طور سے روزانہ اُس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتی —— یا جاننا نہیں چاہتی؟ —— کہ جیسے وہ بے چینی سمجھی ہوئی ہے، خیالات میں وہ آزاد ہے، روہت کے لئے بھی آزاد —— اُس کے دل کے نازک تاروں پر بجتی ہوئی دوسری انوکھی راگنی، جسے سُن کر وہ خود مدہوش ہو جاتی ہے۔

روہت کو اپنے بلند پایہ دیوان سے کچھ بے اطمینانی سی ہونے لگی۔ جس چیز کی وہ بنیاد رکھنا چاہتا ہے، وہ نہیں بن رہا ہے۔ اُسے معلوم ہوا اُس کی بنیادوں کے لئے سدھا کے خیالات کچھ ضرور صحیح ہیں۔ کیا اپنی کویتا میں اُسے وقت کے لحاظ سے محبت کا عنصر بڑھانا ہوگا؟ کیا محبت ہی زندگی ہے؟ کیا سچائی ہی محبت ہے؟ کیا روہت کے دل میں شک پیدا ہونے لگا۔ وہ اپنی ہی گتھیوں میں اُلجھ سا گیا۔

سدھا ہر روز وہاں آتی۔ ہر روز وہ روہت کے مالسرور میں کنکر پھینک کر لہریں پیدا کرتی اور چلی جاتی۔ روہت، کچھ اپنے دل کی گہرائیوں میں پڑا ہوا، تڑپتا، لکھنے کی کوشش کرتا، لکھا ہوا پھاڑ ڈالتا، پھر لکھتا اور پھر پھاڑ دیتا۔ سدھا آتی اور چلی جاتی. پھر آتی چلی جاتی۔ جب وہ آتی، روہت کے دل کی گتھیاں سلجھی ہوئی معلوم پڑتیں۔ جب وہ چلی جاتی، گتھیاں اُلجھی کی اُلجھی رہ جاتیں.... اور روہت سدھا کے آنے کی راہ بڑی بے چینی سے دیکھنے لگتا...

ایک دن سدھا نے وہاں آکر پوچھا: "اِن دنوں تم کچھ لکھ نہیں رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"کیا لکھوں، سمجھ میں نہیں آتا،" روہت نے سدھا کی طرف دیکھتے ہو کہا۔

سدھا جنگل کے چوڑے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی ہوئی، اُس پر لپٹی ہوئی بیلوں کو پیار کر رہی تھی "کیوں —— اچانک، تمھارا دیوالیہ پن کیوں؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں نہ آیا کرو، سدھا۔ تمھاری موجودگی میں مجھ سے لِکھا نہیں جاتا۔..... تم مجھے لکھنے کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں نے بھلا تمھیں لکھنے کو کبھی منع کیا ہے؟ اور اگر میری موجودگی میں تمھارے خیالات پرواز نہیں کرتے۔ تو اس میں میرا کیا گناہ؟" سدھا نے جھک کر روہت کے پاس پڑے

کچھ ٹیسو کے پھول اُٹھا لئے۔ اور اُنھیں اپنے جوڑے میں کھونچتی ہوئی بولی: "لا کتنے پیارے پھول ہیں!"

روہت نے دیکھا سدہا کے جوڑے میں آگ لگ گئی۔ سارا جنگل ان پھولوں سے زیادہ خوبصورت نہ تھا، پر ٹیسو کے پھول بھی اتنے پیارے نظر آسکتے ہیں، یہ اُسے آج ہی معلوم ہوا۔ روہت ایک دم سدہا کو دیکھنے لگا ——— اُس نگاہ سے جس سے کہ کبھی وشوامتر نے منیکا کو دیکھا تھا۔ سدہا کی جوانی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ اُس کی ننگی باہیں، اس کی صراحی دار گردن، اس کے لال رسیلے ہونٹ...

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمھیں،" روہت نے کہا اور فوراً اس کی کلائی پکڑ کر اُسے اپنے پاس، شیر کے چمڑے پر، کھینچ لیا۔ "تم اتنی خوبصورت کیوں ہو؟ عورتوں کو اتنی خوبصورتی اچھی نہیں لگتی۔ یہ بے انصافی ہے ——— آدمیوں سے اس قدر بے انصافی۔"

سدہا کی آنکھوں کے اندر، لمبی لمبی پلکوں کی اوٹ میں، جیت اور محبّت کی لہریں ناچ رہی تھیں۔ سدہا کی گرم کلائی، اس کی موہنی آنکھیں، اس کی نشیلی سانسیں، اس کا اُبھرا ہوا جوبن روہت کے ٹھنڈے ہوئے دل کو سینک دینے کے لئے بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔

"کیا بے انصافی ہے، روہت؟" سدہا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمھاری خوبصورتی۔ تم نے دیکھا —— تمھاری خوبصورتی کے آگے تمام جنگل شرم سے لال ہوا جا رہا ہے۔ دُنیا کی تمام خوشنمائیاں، جہاں کی ساری رنگینیاں تمھیں سجدہ کرنے کے لئے جُھک آئی ہیں!"

روہت کے منھ سے اپنے حُسن کی تعریف سُن، وہ شرما سی گئی۔

"تم ہمیشہ مجھ سے کھنچے ہوئے کیوں رہا کرتے ہو، روہت؟" آخر اس نے پوچھا۔

"کیونکہ میں تم سے —— نفرت کرنا نہیں چاہتا۔" روہت نے سدھا کو زوروں سے جکڑ کر، اس کے لال رسیلے ہونٹوں کو چوم لیا۔ سدھا تھوڑی دیر کے لئے بے سدھ سی ہو گئی۔

"روہت!" کمزور اور کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کہا "روہت!"۔۔۔ تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ بولو، تم بھی مجھے چاہتے ہو۔ میں تمھارے منھ سے سُننا چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

روہت نے سدھا کو چھوڑ دیا۔ "محبت!" اُس نے طنز بھرے لہجے میں کہا، "محبت!۔۔۔۔ اس لفظ سے شاید میں واقف ہوں۔۔۔۔۔ کیا اب تم بھی محبّت کرو گی!"

سدھا کا دل رو اُٹھا۔ روہت کے دل کی تیر اندازی دیکھ

سدھا کا دل رو اُٹھا۔ سدھا جانتی تھی کہ روہت اُن ہستیوں میں سے ہے جو بغیر محبّت کئے اور پائے زندہ نہیں رہ سکتے۔ عورت کے

دبیئے ہوئے زخم پر مرہم رکھنے کے لئے عورت ہی چاہیئے۔ روہت کا زخم بھر دینے کے لئے سدہا جلد بازی کر اُٹھی۔

"تمہارے دل کو کسی نے چوٹ پہنچائی ہے" اس نے کہا۔ "چاہو تو تم اس کا بدلہ مجھ سے لے سکتے ہو۔" سدہا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو کا ایک بوند روہت کے ہاتھ پر ٹپک کر پھوٹ گیا۔ "کیا تمہارے دل میں میرے لئے بالکل جگہہ نہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔" روہت نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اُٹھایا۔ سدہا کا جوڑا اُچھل پڑا، بال کندھوں پر بکھر گئے۔ ٹیسو کے پھول نیچے ڈھلک پڑے۔ "مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تم خوبصورت ہو اور بہت خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ اتنی خوبصورت جتنی کہ یہ ٹیسو کے پھول۔۔۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ جی چاہتا ہے کہ — کہ"

روہت کا گلا سوکھ گیا۔ اس کا تن بدن پھڑکنے لگا۔

"کیا جی چاہتا ہے؟" اپنے چہرے پر سے بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے سدہا نے پوچھا۔

"کہ — تمہیں نچوڑ کر پی جاؤں!"

سدہا نے اپنا جسم روہت کے گود میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ "تو پی کیوں نہیں جاتے۔۔۔۔ تمھیں منع کس نے کیا ہے" اس نے کہا۔ اور تب، اُسے جان پڑا جیسے کوئی بہت آہستہ سے پوچھ رہا ہے:۔ "کیا سوچ رہی ہو؟۔۔۔۔"

تم کہاں ہو، سدھا؟"

٭ ٭ ٭

چار سالوں سے دھول میں پڑی ہوئی وینا، (مادھوی کنج) میں آج پہلی بار بجی، روہت کا یہ انسانیت کا تقاضا دیکھ، پنڈت جی خوش ہو گئے اور باغیچے میں ٹہلتے ہوئے چٹکی بجا بجا کر تال دینے لگے۔ سدھا کو تعجب ہوا۔ وہ یکایک سمجھ نہ سکی کہ روہت کو آج ہو کیا گیا۔ کلیان کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو چھلک آئے۔ سدھا کے پاس جاکر اُس نے یقین کے ساتھ کہا:

"سدھا، تم بڑی اچھی ہو! تم نے روہت کو جلا دیا... چار سال پہلے کا اپنا دوست پھر سے میں نے پالیا۔"

سُدھا اپنے ہاتھوں میں کلیان کا ہاتھ لیتے ہوئے بولی:

"تم سے مجھے کچھ کہنا ہے، کلیان۔"

"نا، کوئی ضرورت نہیں۔" سدھا کے بالوں کو وہ سہلانے لگا۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا، سدھا۔ میں سچ میں بہت خوش ہوں۔

سدھا رو پڑی۔ "کلیان!" اس نے کہا، "کلیان! میں نے تمھیں دھوکا دیا..... لیکن — لیکن ایشور کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میں تمھیں چاہتی ہوں۔ تمھارے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔"

"ارے! کیسی باتیں کرتی ہو۔! روہت نہیں جانتا، لیکن وہ تم سے محبّت کرنے لگا ہے۔ اس کی وینا میں اب سارے تجربے تمھیں سے ملیں گے۔ تم اب اُسے نہیں ٹھکرا سکتیں۔ میں نہیں ٹھکرانے دوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، کلیان، مجھے کیا ہو گیا ہے۔ جب میں تمھارے پاس ہوتی ہوں، دل میرا روہت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب اس کے ساتھ ہوتی ہوں، دل میرا تمھارے لئے تڑپتا ہے!"

"تم تو پگلی ہو۔ آؤ، روہت کے پاس چلیں۔ آج وینا بج رہی ہے۔ آج روہت وینا بجا رہا ہے!"

سدھا کو لئے کلیان روہت کے کمرے میں پہنچا۔ ٹیبل لیمپ کے شیڈ پر سدھا کا ہرا ریشمی بلاؤز ڈال، روشنی مدھم کر دی گئی تھی۔ اُس بلاؤز سے چھن کر ٹھنڈی ہریالی میں، کھڑکی میں بیٹھا ہوا، روہت اپنی وینا میں مست تھا۔ اُس کے پیچھے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں جھول رہی تھیں اور ان کے بھی پیچھے، تاروں سے جڑی، رات کا جھلمل پردا پڑا ہوا تھا۔ آہٹ پا، روہت نے دروازے کی طرف دیکھا، دیکھ کر مسکرا دیا۔ کلیان اور سدھا بھی مسکرا رہے تھے۔

"ایسے نہیں روہت،" اندر آتا ہوا کلیان بولا۔ "یہاں نیچے آکر بیٹھو۔ تم بجانا، سدھا گائے گی۔"

روہت کھڑکی سے اُتر پڑا۔ "ارے واہ! یہ تو مجھے پتہ بھی نہ تھا

کہ تم گا بھی ہو!" اُس نے کہا:

"نا، نا، مجھے گانا وانا نہیں آتا" وہ بولی۔

"آتا کیسے نہیں،" کلیان نے کہا،" اُس دن جو سُنایا تھا مجھے گھاٹ پر۔ چلو، آؤ، اب سنانا ہی ہو گا۔ وہی — بندیا والا"

بڑی مشکل سے، بڑی منتوں کے بعد، سدھا راضی ہو گئی۔ روہت نے وینا کے تار چھیڑے، اور سدھا نے، نزاکت سے کھانس کر، شروع کیا: "کہاں گری رے موری ماتھے کی بندیا"

وینا کی میٹھی جھنکار سے لپٹ کر سدھا کے سُریلے گلے نے خوب سماں باندھا۔"..... موری ماتھے کی بندیا۔ کہاں گری ہو موری ماتھے کی بندیا۔" 'مادھوی کنج' کے اس چھوٹے سے کمرے میں، سدھا کے ہرے بلاؤز سے ڈھکے ہوئے اُس ٹیبل لیمپ کے آس پاس، مستی کا مینھ برسنے لگا۔ "بندیا رے موری ماتھے کی بندیا۔" سدھا کی آنکھوں کا سرور روہت نے دیکھا، کلیان نے بھی دیکھا۔ "بندیا ہو موری بندیا!" اُف! غضب کر دیا! کوئل سی کوک رہی ہے! "کہاں گری ہو — " کتنا سندر بھاؤ ہے! کلیان اور روہت کے دلوں کی خماری اُن کی آنکھوں میں جھلکنے لگی۔ سدھا نے گاتے گاتے دونوں کی آنکھوں میں دیکھا، دونوں کو اپنی آنکھوں میں دیکھتے ہو دیکھا...

اور تب، کچھ، مضراب سے چھیڑے ہوئے وینا کے تاروں کی طرح، اُس کا دل جھن جھنا ہی اُٹھا۔ دل کی جھنکار اس کے کانوں تک پہنچی اُس نے سُنا، اس کا دل کلیان کو پکار رہا ہے، روہت کو پکار رہا ہے۔ ہاں، وہ ان دونوں کو پکار رہا ہے۔ سدھا ان دونوں سے محبت کرتی ہے۔ دونوں میں سے ایک کو بھی وہ نہیں گنوا سکتی۔ وہ دونوں اس کی زندگی میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے دل میں چھائے ہیں، وہ دونوں اس کے ہیں۔ وہ اُن دونوں کی ہے۔۔۔

* * *

"یہ ناممکن ہے، سدھا،" کلیان نے کہا "تمھیں روہت سے شادی کرنی ہو گی۔ مجھے بھول جانا ہوگا۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، کلیان،" روہت بولا۔ سدھا تمھاری ہے۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو، تو میں کبھی تمھارے راستے میں نہ آتا۔ تم میری فکر نہ کرو، تمھاری خوشی میں میری خوشی ہو گی۔"

سدھا کھِل کھِلا کر ہنس پڑی "تم لوگ تو بالکل بچوں کی طرح باتیں کرتے ہو!" اس نے کہا "زندگی بھر تو ایک دوسرے پر جان دیتے رہے، ایک پان بانٹ کر کھایا اور آج تم دونوں کو ایک عورت سے محبت کرنا ناممکن ہو گیا ہے!"

"عورت کچھ پان نہیں ہے، سدھا، جیسے بانٹ کر کھایا جائے

آگے چل کر تم ہی ہم دونوں دوستوں کے دل خراب کرنے کی وجہ بن جاؤ گی۔"

"تمہارا یہ خیال شکی اور خود غرضی پر ہے، کلیان - کیا ایک ماں اپنے دو بچوں کو پیار نہیں کرتی؟ کیا دو بچے ایک ہی ماں سے محبت نہیں کرتے؟ کیا وہ اپنی ماں کو کسی ایک کی ہو جانے کے لئے مجبور کرتے ہیں؟ دو بھائیوں کا دل خراب کرنے کا سبب اُن کی ماں کبھی نہیں ہوا کرتی - بلکہ دو بھائیوں میں محبت اسی لئے بنی رہتی ہے کہ وہ ایک ہی ماں کے ہیں۔"

"تمہاری یہ مثال پھر غلط ہے، سدھا، ماں اور عورت میں فرق ہے - دونوں کی محبت میں فرق ہے۔" دوست نے کہا۔

"محبت میں فرق نہیں ہوا کرتا، دوست - رشتے میں فرق ہو سکتا ہے، محبت میں نہیں - محبت قدرتی ہے، رشتہ بناوٹی۔"

"مگر ایسا کرنے سے دنیا میں گڑبڑ مچ جائے گی، سدھا، سماج کو نقصان پہنچائے گی۔" کلیان بولا:

"اُس سماج کو نقصان بے شک پہنچائے گی - جہاں ایک دوسرے سے ایک دوسرے کو محبت نہیں، اور نہ میں چاہتی ہوں کہ یہ بات اُس دنیا میں رواج پائے۔ مگر اپنی اس دنیا میں —— اس (مادھوی کنج والی دنیا میں —— کوئی گڑبڑ نہیں مچ سکتی - ہم تینوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں - ہم تینوں کسی

ایک کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے۔ تم دونوں میری دو آنکھیں ہو..... اور میرے لئے اس سے زیادہ سکھ کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ میری دونوں آنکھیں مل کر ہمیشہ ایک نظر بنی رہیں۔"

سدہا کی دلیل کا دونوں پر اثر ہوا۔

"میں سمجھتا ہوں، کلیان، کہ میں سدہا کے خیالات سے متفق ہوں،" روہت نے کہا "ہماری اس گتھی کو سلجھانے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔" پھر کچھ مسکرا کر "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ——"

کلیان بھی مسکرایا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ——" وہ بولا "—— لیکن شاید سدہا کے لیے بے انصافی ہو گی۔"

اس مرتبہ سدہا کچھ شرما سی گئی۔

"مگر ہاں، سدہا،" روہت نے کچھ گھبرا کر کہا "تم پتاجی سے کیا کہو گی؟ وہ تو اپنا یہ عجیب تعلق کبھی منظور نہیں کریں گے۔"

"تم اُنھیں نہیں جانتے، روہت،" ماتھے کا پسینہ آنچل سے پونچھتی ہوئی سدہا نے کہا "اُنھیں تم ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر ہی نہ سمجھو۔ اُن کے جیسا بڑا دل شاید ہی کہیں ملے گا۔ ان کی نظروں میں میرے سکھ کی قیمت سب سے زیادہ —— سماج کے اصول —— سے زیادہ۔"

اسی وقت کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ نامکمل دیوان کا پوٹل لیے پنڈت جی روہت کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"تم نے تو کمال کر دیا، روہت،" انھوں نے کہا۔ "ہندی کو آج اس کا جے دیو مل گیا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، تمھاری یہ تصنیف پوری ہونے پر امر رہے گی۔" پھر، سدھا اور کلیان کی طرف دیکھ کر: "تم لوگ نہیں سمجھتے کہ روہت کی یہ نئی رچنائیں بالکل نرالی ہیں؟"

"جی ہاں،" سدھا نے خوش ہو کر کہا۔ "میں نے تو اُن سے اُسی دن کہا کہ ان کے سامنے اب دوسرے سب کویوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سچ میں، روہت، تم اب امر ہو گئے۔"

کلیان — جو کہ شاید روہت کی کویتاؤں کے معنی خود روہت سے بھی زیادہ سمجھتا تھا — بولا۔

"اب تک روہت سب موضوع پر قلم اُٹھا چکا ہے — اور اسی کمال کے ساتھ! یہ خصوصیت کسی دوسرے کوی میں نہیں پائی جاتی۔"

"پنڈت جی مسکرائے۔ "ہاں، ایک موضوع چھوٹ گیا تھا، سو وہ بھی اب برس پڑا۔ کیا نام رکھ رہے ہو۔ روہت، اپنے اس بلند پایہ دیوان کا؟"

"کیا رکھوں؟" روہت ہنستا ہوا بولا۔ "آپ ہی سوچ لیجیے

نہ کوئی نام ——"

"نہیں! کلیان اور للی کے ہوتے ہیں سمجھاؤں! تم سمجھاؤ، کلیان، کوئی نام۔"

"میری رائے ہیں یہ کام سدہا ہی کو سونپنا۔ اچھا ہوگا،" کلیان نے کہا۔ "ان باتوں میں میرا دماغ بالکل نہیں چلتا۔"

تب روہت نے بھی سدہا کی طرف دیکھ کر اسے نام سمجھانے کے لئے کہا۔

"مگر یہ خیال رہے،" کلیان بولا "کوی کے دیوان کے مناسب نام ہو۔ نہیں تو، 'پتنگے کی لاش'، کی طرح تم بھی کہیں سوجھا بیٹھو: 'کھٹمل کا خون' 'چولھے کی راکھ' 'الو کا کلیجہ'۔"

سب ہنس پڑے۔

"ہاں، سدہا، سمجھاؤ نا۔" روہت نے ضد کی:

سدہا نے شرارت بھری آنکھوں سے روہت کی طرف دیکھا۔

"سمجھاؤں؟" وہ بولی،

"سمجھاؤ"

"میری سمجھ میں ڈھیسو کے پھول، نام بہت موضوع رہے گا۔"

کلیان اور پنڈت جی خوشی سے پھڑک اٹھے۔ انھوں نے کہا نام واقعی بہت خوبصورت ہے۔

روہت مسکرایا۔ "بہت اچھا ہے!" وہ بولا۔ "بڑا موضوع!"

ڈھیسو کے پھول ... . "ٹیسو کے پھول"..... اوہ!
سچ میں بہت بڑھیا نام ہے! بہت ہی موضوع! تمھاری
اس سوجھ پر میں داد دیتا ہوں سدھا۔"
سدھا مسکرا رہی تھی۔ "شکریہ" اس نے کہا۔
"شکریہ"

حُسنِ اتّفاق

کئی دنوں کی لگاتار جھڑی کے بعد آج شام کو بادل کھلے تھے۔ بھینی بھینی ٹھنڈی ہوائیں بھی ہلکے ہلکے بہہ رہی تھیں۔ سورج کی بھیگی کرنیں پودوں کی پھول پتیوں پر بکھر رہی تھیں۔ آنگن میں لگے ہوئے گلاب کی نازک ٹہنی پر ایک ننھی سی پیلی چڑیا پھدک پھدک کر چہک رہی تھی۔ قوس و قزح اپنے ساتوں رنگ کی عجیب رنگینی سے آسمان پر بکھرا ہوا تھا میں برآمدے میں کاغذ اور قلم لئے ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی نئی کہانی کے لئے کوئی عنوان سوچ رہا تھا۔ بارش کی فضا میں ایک لوچ ہوتا ہے، جو افسانہ نویس کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مگر وہی لوچ احساس تاریک پہلو میں اُجاگر ہوتا ہے تو مصنف ایک خاموش تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ قدرت کی صنّاعی پر عبور حاصل ہو، تو اُس بڑے فن کار کی بے مثال فنکاری پر دل نچھاور

کر کے مصنف دل ہی دل میں تخلیق کرنے والے کی تعریف کرنے لگتا ہے اُس تعریف کو دنیا کی کوئی زبان لفظوں میں مقید نہیں کر سکتی۔ کچھ عقلمند انسانوں کو اپنی قوتِ متخلیہ اور علمی تجربہ کی، اس فضا میں معنی خیز حالت کے انکشاف سے، جو آخری مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ بھی اُسے کہیں نہیں ملتی —— بہترین کہانی کے لکھنے میں بھی نہیں۔

میں نے بار بار سر کھجایا، بار بار قلم اُٹھایا، مگر کوئی عنوان سمجھ میں نہیں آیا۔ سمجھتا بھی کیسے جبکہ میری تمام قوتِ متخیلہ اپنے غیبی فن کار کو اُس قوسِ قزح کی طرح سجدہ ریز میں محو تھیں۔ نوکرانی کو پکار کر اُس سے میں نے کافی لانے کو کہا اور پیڈ پر اپنی کہانی کا عنوان کھینچنے کی کوشش کرنے لگا، کیونکہ کبھی کبھی عنوان سوچتے سوچتے مضمون بھی مل جاتا ہے۔ مگر کچھ ہی دیر میں، میں نے دیکھا کہ میرے قلم نے سارے صفحے آدمیوں کی شکلیں بنا بنا کر بھر دیئے ہیں اور میرا منہ، طالب علمی زندگی میں کبھی کسی نوٹنکی میں سُنی ہوئی، کوئی پُرانی پھڑکتی ہوئی چیز گنگنا رہا ہے۔ دونوں میری بہت پُرانی عادتیں تھیں، جو مجھے بیکار دیکھ، مجھ پر حاوی ہو جاتی تھیں، اور تب میں سمجھ جاتا تھا کہ لکھنے کی کوشش کرنا بیکار ہے، اس وقت دماغ بالکل نہیں چلے گا۔ لہٰذا، کاغذ، قلم تپائی پر رکھ کر میں نے جیسے ہی سگریٹ جلائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ سامنے، دور سڑک پر، سرجو پرشاد تیواری چلے آرہے ہیں۔

تیواری جی سے میری پُرانی ملاقات تھی۔ کسی زمانے میں وہ

میرے پڑوسی تھے۔ سکریٹریٹ میں کلرکی کرتے کرتے جب، کچھ پیسہ جمع ہوگیا، تب اسٹیشن کے پاس، تھوڑی زمین لے کر چھوٹا سا دو منزلہ مکان بنوا کر ماں اور بیوی کے ساتھ وہ وہیں رہنے چلے گئے۔ اوپر کے حصّے میں خود رہتے تھے اور نیچے کا کرایہ پر دے رکھا تھا۔ کان کے پاس چھٹکے ہوئے بال اور آنکھوں کے کنارے پر پڑی ہوئی لکیروں کے لئے ان کی عمر اتنی جوابدار نہیں تھی، جتنی کہ اُن کی بیوی، وہ بانجھ تھی ـــــ اور پھر اوپر سے مزاج شکی تھا۔ گھر میں ایک منٹ کے لئے بھی چین کا ملنا تیواری جی کے لئے دشوار ہوگیا تھا۔ دیوی جی دن بھر تیوری چڑھا کر چخ چخ کرتیں۔ اور تیواری جی گالوں میں پان دبائے ہنسا کرتے۔ جب دیوی جی کا پارہ زیادہ چڑھ جاتا۔ تو چپکے سے چھڑی اُٹھا کر وہ اپنے کسی دوست کے گھر گپیں چھانٹنے چل دیتے۔

"اماں، کیا کر رہے ہو اکیلے چھپر میں بیٹھے؟" انھوں نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

آئیے، تیواری جی، بغل کی کرسی میں اُنھیں بٹھلاتے ہوئے میں نے کہا۔ "اپنی کہانی کے لئے عنوان سوچ رہا تھا۔ بہت دنوں بعد درشن ہوئے سب خیریت تو ہے؟"

سب خیریت تو ہے؟" میں چھپا ہوا اشارہ سمجھ، تیواری جی مسکرائے۔

"ہاں، سب خیریت تو ہے، کراونک بیماریوں میں کوئی فکر کی بات نہیں ہوا کرتی،" انھوں نے کہا۔ نوکرانی کافی کا ٹرے لئے باہر آئی اور ہمارے سامنے میز پر رکھ گئی۔

"اماں، آج کے دن —— ایسے سہانے وقت میں بھی کیا تم کافی پیو گے؟" تیواری جی نے شکایت کی۔ "آج تو چھننی تھی بھنگ، بھنگ سے چھلکتا ہوا کانسے کا کٹورا ہونا تھا۔ اور دونی چند حلوائی کی دوکان کے پیڑے ہونے تھے۔"

آپ تو جانتے ہیں، تیواری جی، میں نے آج تک بھنگ کو کبھی چھُوا تک نہیں، اگر کہیئے تو مٹھائی منگوائی جائے؟"

"نا، اب رہنے دو، آج کافی ہی سہی۔ یار، تم بھی رہے نرے بدھو ہی، اچھا، اب ہمارے لئے حقّہ تو بھر واؤ۔ بہت دن ہوئے تمھارے یہاں کا لکھنؤ والا خمیرہ پیئے۔"

اُسی وقت نوکرانی حقّہ کی چلم پھونکتی باہر آئی، "لیجیے۔" میں نے ہنس کر کہا، "تیواری جی کی خاطر داری کرنا بیلا خوب جانتی ہے۔"

"بھائی، مان لیا ہم نے، قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی نمازی ہوتے ہیں۔ کہو، بیلا رانی، کیسی ہو۔؟"

حقّہ رکھ کر، بیلا شرم سے اندر بھاگ گئی۔ شہر بھر میں بیلا سے زیادہ کالی چڑیل دوسری نہ ہو گی، ہماری شری متی نے اسے خاص طور پر چُن کر رکھا تھا۔

پیالیوں میں، میں نے کافی اُنڈیلی اور بڑے تیواری جی کی طرف بڑھا دیا۔ پیالی اُٹھانے کے لئے وہ جیسے ہی جُھکے اُن کے

کوٹ کی جیب سے سونے کی چین میں لگی ہوئی ایک لیڈیز رسٹ واچ نکل کر نیچے لٹک گئی - اس رسٹ واچ کو میں ان کے پاس کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا - ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ ایک عجیب عادت ہوتی ہے - زنانی ہاتھ گھڑی کو جیب گھڑی بنائے کوٹ میں رکھنا، میں تیواری جی کی ایک عجیب عادت ہی سمجھے ہوا تھا اور اس لئے دوستوں کی طرح میں نے کبھی تیواری جی کا مذاق نہیں اُڑایا - مگر آج سونے کی اُس نازک سی خوبصورت رسٹ واچ کو اپنی آنکھوں کے اِتنے پاس ہی جھولتے دیکھ کر میرے دل میں کچھ تھوڑا اچھل سا ہوا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے، جو سکریٹریٹ کا ایک معمولی کلرک ہمیشہ اپنے ساتھ اتنی قیمتی زنانی گھڑی لئے پھرتا ہے - تیواری جی کے کان میں اگر قلم یا پنسل کھونسی ہوئی ہوتی، تو میں اس بات کو سمجھ سکتا تھا، مگر اُن کا لیڈیز رسٹ واچ اپنی چھاتی سے لگائے رکھنا - میرے تخیلات کی دنیا سے ایک دم باہر تھا -

"تیواری جی، ایک بات پوچھوں، بتلائیے گا؟" میں کہہ تو بیٹھا۔

"پوچھو؟"

"آپ ہمیشہ یہ زنانی گھڑی کیوں ساتھ لئے پھرتے ہیں؟ بھابی جی کی یہ دی ہوئی تو نہیں جان پڑتی۔"

تیواری جی کا چہرہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ پیالی خالی کر کے اُنھوں نے حقّہ کی نے اُٹھا۔ منہال ہونٹوں کے بیچ لی۔ دو ایک کش لے کر پھر کچھ موٹی سی آواز میں بولے: "کسی کی یادگار ہے یہ۔ آخری تحفہ۔" گھڑی ہاتھ میں لے کر وہ اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگے —— مجھے صاف جان پڑا کہ اس ہشت کونا گھڑی کے ننھے سے کانچ پر تیواری جی کی آنکھوں کو کوئی تصویر ضرور دکھائی دے رہی ہے۔ ایک کلرک کی زندگی میں بھی، کسی کی یادگار، "آخری تحفہ" جیسی کوئی چیز ہو سکتی ہے، اس بات نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا۔

"آخری تحفہ؟" میں نے کچھ اور زیادہ دلچسپی سے پوچھا۔ "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس قصہ کو جاننا چاہوں گا، بہت مرتبہ جی میں آیا کہ آپ سے پوچھوں مگر پوچھ نہیں سکا۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں،" تیواری جی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مگر سُن کر تمھارا دل خراب ہو جائے گا دوسرے، تم ٹھہرے افسانہ نویس نہ تمھارے سامنے کچھ بولتے بھی زبان رُکتی ہے۔ مگر ٹوٹے پھوٹے جیسے بھی ہو سکے آج میں تمھیں اپنی آپ بیتی سناؤں گا۔ اور کچھ نہیں تو میرا دل تو ہلکا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی دل کی لگی سنانے کو بھی جی کرتا ہے۔"

"ضرور سنائیے، بات مجھ سے باہر نہیں جائے گی میں اطمینان دلاتا ہوں۔"

"مجھے اطمینان ہے،" انھوں نے کہا۔ "اور اگر جائے بھی تو کوئی حرج نہیں۔ میری زندگی میں اگر کوئی ایک خاص واقعہ درپیش ہوا ہے۔ جس پر مجھے فخر ہے تو وہ بھی ہے ...... اُس بات کو سات سال ہونے آئے۔ مکان میرا نیا بن کر تیار ہوا تھا۔ تم تو جانتے ہو۔ مجھ سے گھر پر زیادہ دیر رہا نہیں جاتا۔ رات کے کھانے کے بعد روزانہ تھوڑی دیر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جاکر ہیں گھوم پھر لیا کرتا تھا۔ گاڑیوں کے آنے جانے میں، پلیٹ فارم کی چہل پہل میں طبیعت تازہ ہو جاتی تھی،" اِدھر گرینڈ ٹرنک چھوٹتی تھی اُدھر میں بھی گھر چلا آتا تھا۔

"وہ اتوار کا دن تھا۔ شام کو آنے والی بمبئی میل چار گھنٹے لیٹ ہو کر رات کو ساڑھے نو بجے آئی تھی۔ اسٹال میں سے میں نے ایک ڈیڑھ پیسے کی قینچی خریدی اور دھیلے کا پان اور اپنی عادت کے مطابق پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ روزمرّہ کے جانے سے اسٹیشن کے تمام ذمہ دار میرے ملاقاتی ہو گئے تھے نہ اس لیے کوئی مجھے پلیٹ فارم ٹکٹ کے لئے روکتا ٹوکتا بھی نہ تھا۔ بلکہ کسی دن اگر کسی سبب میں وہاں نہ جا پاؤں، تو انھیں

بڑا تعجب ہوتا۔ کئی لوگ تو مجھے ریلوے یا سی. آئی. ڈی۔ کا آدمی سمجھ کر لمبے لمبے سلام ٹھوکا کرتے۔ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے، گالوں میں دھیلے کا پان دبائے، ڈیڑھ پیسے کی سگریٹ پھونکتا ہوا میں اس دن بھی بمبئی میل کے سامنے چہل قدمی کر رہا تھا، یکایک سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی ایک بنگالی عورت کو دیکھ کر میری آنکھیں چکاچوندھ ہو گئیں. بنگلہ کی کوئی کتاب پڑھنے میں وہ مشغول تھی۔ اس کی پتلی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔ بدن پر چوڑے لال پاٹ کی رنگین ریشمی ساڑی لپیٹے ہوئے تھی۔ میں اور زیادہ نہیں کچھ دیکھ سکا۔ سکتے کے عالم میں کھڑا بس دیکھا کیا —— اور دیکھ کر بھی نہیں کچھ دیکھا۔ اس بلا کی خوبصورتی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ اس کے بعد ہی کبھی دیکھی۔ کو خوبصورتی نہیں کہہ سکتے۔ خوبصورتی اکثر بگڑ بھی جاتی ہے تم اُس کو خوبصورتی کی جان کہیں گے۔ بے زوال حسن۔ ایسا معلوم ہوا کہ آج میں نے بھگوان کا روپ دیکھ لیا. میرے دل میں اس عورت کے متعلق ایک قسم کی عزت —— بلکہ اُسے بھگتی بھی کہہ سکتے ہیں —— پیدا ہونے لگی۔ اس عورت نے ایک دفعہ کتاب کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ میں اس کی کھڑکی کے سامنے ہی کھڑا رہا۔ کھڑا کھڑا

دیکھا کیا۔ نہ میرے قدم ہٹتے تھے اور نہ نگاہ ہٹتی تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں پاگل کی طرح کھڑا ہوا گھور رہا تھا۔ کہاں ہوں، کیا کر رہا ہوں، اس کا مجھے خیال تک نہ تھا۔ اچانک میں نے سُنا کوئی زور زور سے کسی پر بگڑ رہا ہے، آواز مردانی تھی۔ میرا خیال ٹوٹ گیا۔ مڑ کر دیکھا، ڈبے کے دروازے میں، ڈھیلی ریشمی کرتا پہنے، موٹے کانچ کا چشمہ لگائے، ایک بنگالی، مہاشے کھڑے ہوئے مجھے پھٹکار رہے تھے۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کسی عورت کو اس طرح گھورتے ہوئے؟" انھوں نے انگریزی میں مجھے سُنایا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے؟" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ "میں ان پر کسی طرح چوٹ تو نہیں کر رہا ہوں؟"

"جانتے ہو، کسی عورت کو گھورنا گناہ ہے؟"

"ہو گا صاحب، مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کسی بُری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ میں نے اُنھیں ماں یا بہن سمجھ کر ہی دیکھا ہے۔"

"اچھا، اچھا، اب آپ مہربانی کر کے ہٹ جائیے، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"ناراض نہ ہوئیے" میں نے کہا۔

"مجھے اسٹیشن ماسٹر کو بُلانا پڑے گا۔"

" 'اس سے کیا فائدہ ؟'

" 'میں پولیس کو خبر کردوں گا۔'

" 'ڈرائیے مت، جو چاہے کیجیے۔'

" 'وین اِٹ سمیز آئی وِل ہیو ٹو ٹیک دی لاء اِن ٹو مائی اون ہینڈز،' " کہتا ہوا وہ آدمی کرتے کی آستین چڑھا کر ڈبہ سے نیچے اترنے لگا، مگر اسی وقت اس کی بیوی نے لپک کر پیچھے سے اس کا کرتہ پکڑ لیا۔

" 'اے جی کی کور چھو!' اس نے کہا۔ وہ آدمی خود کہہ رہا ہے کہ میں ماں یا بہن سمجھ کر دیکھ رہا ہوں اور تم بگڑے جا رہے ہو!

" 'وہ آدمی مہذب نہیں معلوم ہوتا ہے۔'

" 'اے تمار بھول۔' پھر مجھ سے کہا: 'کم برادر! کم ان!'

" 'نہیں بہن،' میں نے کہا، 'اتنا ہونے پر کیا اب یہ ٹھیک ہے؟'

مگر اس نے التجا کی، پھر اس کا مرد بھی مجھے اندر بلانے لگا، میں کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کمپارٹمنٹ کے سامنے لگی ہوئی بھیڑ اس تماشے کو دیکھ کر حیرت میں تھی۔ پھر چائے منگوائی گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اپنا مدعا سمجھایا۔ تب اس عورت نے کہا کہ وہ بھی اس وقت اپنی بنگلہ کتاب میں اسی طرح کا ایک خیال پڑھ رہی تھی۔ خدا کے بنائے ہوئے حسن میں خدا کی جھلک۔ ہم تینوں کے دل میں

ایک ساتھ ایک دوسرے کے لئے عجیب خلوص پیدا ہو گیا۔ گاڑی چلنے کو تھی۔ میں نے اُترنا چاہا، مگر ان لوگوں نے اگلے اسٹیشن تک ساتھ چلنے کی ضد کی۔ مجھے مان لینا پڑا۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں اگلے اسٹیشن پر انھوں نے پھر نہیں اُترنے دیا۔ کہا کہ اگلے جنکشن پر اُتر جانا۔ پھر تو مجھے اصلی بات صاف کہہ دینی پڑی کہ میرے جیب میں اتنے کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔ "تم مجھ سے لے سکتے ہو۔۔۔۔ اپنی بہن سے"، سندھیا نے کہا۔ "نا، بہن سے کچھ بھی لینا ہم لوگوں میں گناہ سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔ میں نے کہا۔ تب مسٹر گھوش بولے: "مجھ سے تو لے سکتے ہو؟ چلو، اب باتیں نہ بناؤ: تم یہاں نہیں اُتر سکتے۔ اگلا اسٹیشن جنکشن ہے، وہاں چاہے اُتر جانا۔" میں مان گیا۔

"مسٹر۔ اتول چندر گھوش کلکتہ میں اونی کپڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ چورنگی اور نیو مارکیٹ میں اُن کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ ان کی عورت، سندھیا کنواری، کی تعلیم شانتی نکیتن میں ہوئی تھی، ابھی اسی مہینہ ان کی شادی ہوئی تھی۔ سیر کے لئے "ویانہ" جا رہے تھے۔ وہاں سے ولایت، امریکہ بھی جانے کا خیال تھا۔ میرے بہن نہ تھی۔ اور سندھیا کے بھائی نہ تھا؛ اس لیے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہن بھائی بنا لیا۔

"بمبئی سے "ویانہ" سے "نیو یارک" سے وہ لوگ مجھے

برابر خط لکھتے رہے۔ کبھی کبھی وہاں کی بنی ہوئی چیزیں بھی میرے لئے بھیجا کرتے۔ لوٹتے وقت پھر میں اُن سے اسٹیشن پر ملا۔ کلکتہ سے بھی وہ مجھے برابر خط لکھتی رہی۔ میں اور سندھیا سچ مچ بہن بھائی بن گئے تھے۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں ہر سال میں کلکتہ جاکر۔ اُن کے یہاں کچھ دن رہ آیا کرتا۔ اس طرح چار سال بیت گئے اور پھر ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میری سندھیا بہن مردہ جسم کی طرح پڑی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ دوسرے ہی دن میں نے اتول گھوش کو کلکتہ تار دے کر خبر پوچھی۔ جواب آیا:

'فوراً چلے آؤ۔ سندھیا کی حالت نازک ہے'

"ہاوڑا اسٹیشن پر گھوش کے یہاں کا آدمی مجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے اُس سے سندھیا کی حالت پوچھی۔ اس نے کہا صبح سے زبان بند ہے۔ میں سن ہو گیا۔ موٹر سے اُتر کر جیسے ہی میں 'سندھیا بھون' میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ کسی نے مجھے اندر پہنچایا، کمرہ میں داخل ہوتے ہی اتول مجھ سے لپٹ گیا: زبان بند ہونے سے پہلے تک تمھاری یاد کر رہی تھیں۔ اُس نے کہا۔

سندھیا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر یکایک مجھے یاد آیا کہ چلتے وقت ماں نے ہمگرم کی گولی میری جیب میں رکھ دی تھی۔ میں نے

اتول سے کہا کہ علاج کرنے کا موقع ایک مجھے بھی دیا جائے، ویسے تو سب نا امید ہو ہی چکے ہیں۔ میں نے ہمگرم کی گولی گھس کر سِندھیا کو چٹا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے اندر طاقت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ آنکھیں جھپکنی بند ہو گئیں۔ دانتوں کی چوکھٹ کھل گئی۔ اور اس نے منھ سے آواز نکالی۔

"اے شے چھو، دادا!" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ "تمار راستہ ای دیکھ چھلم"! پھر سرہانے پڑی رِسٹ واچ اپنے کمزور ہاتھوں سے اُٹھا کر مجھے دیتی ہوئی بولی: "میری طرف سے یہ تمھیں "آخری تحفہ" ہے —— بہن کا اپنے بھائی کو "آخری تحفہ"! میں رو رہا تھا۔ سب رو رہے تھے۔ سِندھیا نے اتول کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ وہ روئے نہیں پھر اس کے پیر پکڑ کر انھیں پر اس نے اپنا سَر رکھ دیا اور..."

رِسٹ واچ کو اپنے گندے رومال سے پونچھتے ہوئے تیواری جی نے ایک لمبی سانس لی۔ "بات بالکل کہانی سی معلوم ہوتی ہوگی نا؟" انھوں نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو میری نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی بھی تو کہانی ہی ہوا کرتی ہے، تیواری جی،" میں نے جواب دیا: "بلکہ اکثر کہانی سے بھی زیادہ عجیب۔ معاف کیجیے گا مجھے معلوم نہ تھا کہ اس رِسٹ واچ کے پردے میں اتنا درد چھپا

ہوگا --- ورنہ میں آپ کا زخم نہ کریدتا۔"

تیواری جی مسکرائے! منھ سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے: "تمھیں اپنی نئی کہانی کے لئے عنواں کی ضرورت تھی. اگر چاہو تو اسے استعمال کر سکتے ہو۔"

میں بھی یہ سوچ رہا تھا ۔ مگر اجازت مانگنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔

"شکریہ،" میں نے کہا۔ "مگر کہہ نہیں سکتا کہ جس درد سے آپ نے یہ سُنائی ہے، وہ درد کہانی میں پیدا کر سکوں گا یا نہیں۔ میری ناکامیابی آپ کے اور سندھیا بہن کے متعلق کہیں بے انصافی نہ ہو جائے۔"

تیواری جی پھر مسکرائے ۔ "مجھے تمھاری قلم پر بھروسہ ہے" انھوں نے کہا اور پھر حقّہ کے کش لینے لگے ؛ ۰ ؛

کُدالی

بو درا کے مہابیر کا پجاری، رام سروپ، اپنی چھوٹی سی بوڑھی جھونپڑی کے آنگن میں، ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا، مٹی کے دیئے کی روشنی میں (پوران، پڑھ رہا تھا، اور اُن کی بیٹی تلسی، منگرو چودھری، بھولا نائی، چیتو سونار کا بھتیجہ، بھیکو، اور گاؤں کے دیگر پچیس تیس اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے اس کے پاس زمین پر بیٹھے بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے۔

گھوگھانڈی کے کنارے بسے ہوئے بودرا گاؤں کے غریب، کسان، زمیندار ٹھاکر بھوپ سنگھ کے ظلم سے کراہ کر، پجاری رام سروپ کی نصیحتوں سے اپنے زخم دھویا کرتے تھے۔ ویسے بھی اُس دو ڈھائی ہزار کی آبادی والے گاؤں میں عوام کے دل کو تسکین دینے کے لئے کوئی بھی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے، رام سروپ

کے چھوٹے سے اوبڑ کھابڑ آنگن میں ہی کھانے کے بعد اپنا تھوڑا سا وقت گذارنے کا بودرا کے رہنے والوں کو ایک قسم کی مشق ہو گئی تھی طبیعت بھی بہل جاتی تھی اور مِل بیٹھنے کا اچھا موقع بھی مل جاتا تھا اُن کا سارا دن یا تو کھیتوں پر ہل بیل کے ساتھ گزرتا یا زمیندار کی بیگار میں - رام کا نام لینے کا بس انھیں یہی ایک وقت ملتا تھا کبھی کبھی جب بھیکو کو لہر آتی اور وہ اپنی ڈھولک لئے پُجاری مہاراج کے آنگن میں بیٹھ کر چوپائی سُناتا تو سارا بودرا وہاں اُلٹ پڑتا پچھلے ساون میں ایک رات جب اس نے آلہا گایا تھا - تو موسلا دھار پانی برسنے پر بھی لوگ ساری رات آنگن اور گلیوں میں ڈٹے رہے تھے اور تبھی لوگوں کو محسوس ہوا تھا کہ بھگوت پاٹ نیز مذہبی کاموں میں کسی ایک جگہ اکٹھا ہونے کے لئے اُنھیں کوئی خاص انتظام کرنا چاہیئے۔

پنچوں کی رائے میں یہی ٹھہرا کہ پنڈت رام سروپ کے پیپل کے نیچے والے مہابیر کے لئے آپس میں چندا کر کے ایک پکا مندر بنایا جائے اور اُس کے پاس کی تھوڑی سی زمین ٹھاکر سے مانگ کر لوگوں کے بیٹھنے کے لئے - وہاں ایک بڑا سا چبوترا بھی بنا دیا جائے - مگر چندے کا پیسہ تو کافی نہیں ہوگا - اور پھر زمیندار کی اجازت بھی چاہیئے ہی تھی -

لہٰذا منگرو چودھری نے ہمت کی اور اُن کی رہبری میں بودرا

کے باشندوں نے ٹھاکر بھوپ سنگھ سے جاکر گاؤں کے لئے مہابیر کا مندر بنوا دینے کی التجا کی ۔

ٹھاکر کسی بات پر جلدی راضی نہیں ہوتے تھے ۔ زمین تو وہ تھوڑی بہت دے بھی سکتے تھے ۔ لیکن اپنی تجوری سے — بودرا کے غریب کسانوں کے خون کا پانی کرکے بھری ہوئی تجوری سے

سرکاری افسروں پر بودرا کی قربانی چڑھاکر بھری ہوئی تجوری سے، بودرا کی ماں بہنوں، بہو بیٹیوں کی ہائے لے کر بھری ہوئی تجوری سے — بودرا کے رہنے والوں کے بھگوان کا گھر بنانے کے لئے ایک پیسہ بھی دینا انھیں منظور نہیں تھا ..... پر کیا کرتے؟ دھرم کا کام، تھا — دکھانے کے دانت کبھی کبھی مہنگے پڑتے ہیں !— اور گاؤں والوں نے ایک ساتھ مل کر اُن کی ڈیوڑھی پر ماتھا رگڑا تھا ۔ پھر، مہابیر کے ایک مندر میں پجاری رام سروپ کو وہ ہمیشہ کے لئے خرید سکتے تھے، بھیکو تو پجاری کے کہنے میں تھا ۔ رام سروپ کی بیٹی تلسی تک پہنچنے میں انھیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی ۔ ٹھاکر نے مہابیر کے لئے مندر بنوا دینے کا وعدہ کر دیا ۔

مگر اس بات کو آج چھ مہینے ہونے آئے اور ٹھاکر نے مندر کی خبر تک نہ لی، کیوں کہ رام سروپ نے تلسی کو بھیجنے سے انکار کر دیا تھا ...... جب لوگوں کو اصلیت معلوم ہوئی تو انھیں دل میں ٹھاکر پر بڑا غصہ آیا ۔ بھیکو تو آپے سے باہر ہو گیا

تھا۔ تُلسی نے اُسے راکھی باندھی تھی۔ اُس نے تُلسی کو بہن مانا تھا۔ پیپل والے مہابیر پر ہاتھ رکھ کر اُس نے قسم کھائی کہ اگر ٹھاکر نے تلسی کی عصمت دری کی تو وہ اُنھیں زندہ نہیں چھوڑے گا — چبتو سونار کے بھتیجے بھیکو سے — سارا گاؤں دبتا تھا۔ گاؤں بھر میں وہ بکھیڑے کھڑے کیا کرتا تھا۔ کسی کے دہ آم چرا لیتا، کسی گھر سے کنڈے چھین لاتا، اور خاص کر زمیندار کے کھلیانوں اور چوپالوں سے اناج چُرانا تو اُس کا روز کا کام تھا۔ مگر اس سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ کیوں کہ بدلے میں وہ سارے گاؤں کو اپنی بانسری اور دف سے خوش کیا کرتا، اپنی چوپایوں اور گانوں سے وہ لوگوں کے دل خوش کیا کرتا۔ وہ تھوڑی بہت دیدک بھی جانتا تھا۔ گاؤں میں جب کسی کو سانپ یا بچھو کاٹتا تو بھیکو کی ہی طلب ہوتی۔ اور پھر لودرا کی بہت سی بے سہارا عورتوں کا وہی تو ایک محافظ تھا۔ اس طرح وہ نِکما، نٹھلا، منھ زور، لڑاکو بھیکو لودرا کا بہت ضروری حصّہ تھا۔ اگر بھیکو کسی سے گھبراتا تو ٹھاکر بھوپ سنگھ سے، اور ٹھاکر بھوپ سنگھ کو کسی کا خوف تھا تو بھیکو کا۔ دونوں ایک دوسرے کے نام سے کانپتے تھے۔

جب کتھا ختم ہوئی تو منگرو چودھری نے پجاری رام سروپ سے کہا،

"مہاراج، جان پڑتا ہے مندر کبھی نہیں بنے گا۔ اب کی ساون بھی تمھارے آنگن میں بھیک کر ہی کٹے گا۔!

"ہماری بدقسمتی!" پجاری نے کہا۔

تلسی کا نازک خوبصورت مکھڑا اُداس ہو کر لٹک گیا۔ بھیکو نے دیکھا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، جو دیئے کی لال روشنی میں خون کے قطرے سے معلوم پڑے۔

"پروا نہیں، چودھری"، بھیکو بولا۔ "اپنی ماں بہنوں کی لاج بیچنے سے ہم مر جانا پسند کریں گے۔"

"بے صبر نہ ہو۔ مہابیر نے چاہا تو مندر بھی کبھی بن ہی جائے گا" پجاری نے دلاسا دلایا۔

"بن کیوں نہیں جائے گا، مہاراج"، بھولا نائی نے کہا۔ "اگر ہم ہی لوگ ذرا ہمت کریں تو مندر کے لئے آپس میں ہی چندہ جوڑنا کون مشکل بات ہے۔ کیوں چودھری؟"

منگرو چودھری نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ کل ہی سے چندا وصول کرنا شروع کر دیا جائے۔"

"اور زمین؟" بشن نے پوچھا۔

"میرے گھر کا آنگن بابا کے آنگن میں ملا دیا جائے"، بھیکو بولا، "ہم دونوں کی زمین ملا کر کافی زمین ہو جائے گی۔ کیوں بابا؟"

رام سروپ نے اپنی پوتھی باندھی، "ٹھیک ہے مجھے کوئی مشکل نہیں دیکھ پڑتی"، اُس نے کہا۔ "یہ تو دھرم کا کام ہے۔ سب کو ہاتھ بٹانا ہی چاہیئے۔"

* * *

اپنے اصطبل کے سامنے کھڑے ہوئے ٹھاکر بھوپ سنگھ گھوڑے کے پیروں میں لوہار سے نعل ٹھکوا رہے تھے۔ اُنھیں گھوڑوں کا خاص شوق تھا۔ اُن کے اصطبل میں چند ایسے گھوڑے تھے جنھیں دیکھ کر آتے جاتے سرکاری افسروں کے منھ میں پانی چھوٹتا تھا۔ اُن کی نیت ڈانوا ڈول ہونے لگتی تھی۔ اور یہ کاٹھیاواڑی کمیت جو کہ اُنھوں نے پچھلے دسہرے میں، ایک بڑی رقم دے کر، کسی بلوچی سوداگر سے خریدا تھا، علاقہ بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

تین پیروں پر کھڑے ہوئے موتی کو اچانک چٹپٹاتے ہوئے دیکھ کر ٹھاکر بھانپ گئے کہ کیلا سُم کے نازک جگہ پر جا لگا ہے۔ فوراً بگڑ کر بولے

"ابے، کیلا کہاں ٹھوک رہا ہے؟ کیا جانور کو لنگڑا کرے گا؟"

نتھو لوہار سنبھل گیا۔ کیلے کو سنسی سے چٹ باہر کھینچ، دوسرا ٹھوکتا ہوا بولا:

"نہیں سرکار، ذرا اندر لگ گیا تھا۔ پارسال ہم ہی تو نعل لگاتا رہا۔"

ٹھاکر کی چڑھی ہوئی تیوری ابھی اُتر ہی رہی تھی کہ اُن کے خوشامدی کارکُن، بہاری، نے آکر مندر کا کام شروع ہو جانے کی انھیں خبر دی۔ ٹھاکر کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔

"سرکار، یہ سب پجاری رام سروپ کی کارستانی ہے۔"

کانا بہاری سرکار کو ذرا بازو میں لے جا کر بولا۔ "اُس نے آپ کو نیچا دکھلانے کے لئے گاؤں والوں کو اُکسایا ہے۔ اور بھیکو کی اُس کو اندرونی شہ ہے۔ ورنہ بودرا کی کیا طاقت تھی کہ اپنے زمیندار کی مدد کے بغیر ہی مندر کا کام شروع کر دیتے۔"

بہاری کے بنا ٹھاکر کا کام ایک منٹ بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اُن کے سات گاؤں کی دیکھ ریکھ، حساب کتاب کانے بہاری ہی کے ذمے تھا۔ لوگوں سے لگان کا ایک ایک پیسہ کس طرح وصول کرنا وہ خوب جانتا تھا۔ بہاری کی مہربانی اور ٹھاکر کی بے مروّتی سے زمینداری میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جو زمیندار کے چنگل میں پھنس کر اُجڑ چکے ہوں، اب کی نمک حلال بہاری کی مہربانی بھیکو اور رام سروپ پر ہونے کو کر رہی تھی۔ بھیکو پر اس لئے کہ اس نے، کچھ دن ہوئے، بہاری کو کنوئیں میں پھینک دینے کی دھمکی دی تھی اور بہاری کا اُس کے گھر کے پاس سے آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ رام سروپ پر اس لئے کہ اس نے اپنی خوبصورت بیٹی تلسی کو زمیندار کی رنگین طبیعت کا کھیل بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

"یہ مجال!" ٹھاکر لال پیلی آنکھیں کرتے ہوئے بولے، "اُس پجاری کے بچے کی اتنی ہمت کہ میری بات کاٹ دے! گھر بکوا دوں گا سالے کا، سمجھا کیا ہے اُس نے!"

"ذرا دیکھیئے نا، سرکار، چالاک کتنا ہے! دھرم کا

سوانگ رچ کر سارے گاؤں کا مکھیا بنا بیٹھا ہے۔ گاؤں بھر میں تو اُس کی بیٹی آنکھ لڑاتی پھرتی ہے اور جب سرکار کی ذرا طبیعت ہوئی تو بس پاک دامن بن بیٹھی!!

"مندر نہیں بنے گا۔" ٹھاکر کے دل میں غصہ کی جوالا بھڑکنے لگی، اُن کے ماتھے پر اُبھری ہوئی رگ پھڑکنے لگی۔ "آج ہی پجاری کے گھر کو آگ لگادی جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اور تُلسی کو صحیح سلامت نکال کر کوٹھی پر حاضر کیا جائے۔ سمجھے"؟

"ذرا اطمینان سے کام لیجیے، سرکار،" بہاری نے صلاح دی۔ گاؤں والے کہیں بھڑک نہ اُٹھیں۔ رام سروپ پر اپنے روپے نکلتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے رہیے۔ اس کی تو کمر میں ابھی توڑے دیتا ہوں، سرکار کی بس اجازت بھر چاہیے!"

تمھیں پوری اجازت ہے، سونے کی سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر جلاتے ہوئے ٹھاکر نے کہا۔ جو چاہو سو کرو، مگر جب تک تلسی نہ بس میں آجائے، مندر نہ بننے دو۔"

"مندر نہیں بنے گا سرکار۔ جب پجاری کا گھر اور زمین نیلام ہوگی، وہ اپنے آپ راستے پر آجائے گا۔" تلسی کو خود آپکے چرنوں پر رکھ جائے گا۔"

اپنے ہونٹوں کے ایک کونے سے کچھ مسکرا کر ٹھاکر نے بہاری کے دماغ کی تعریف کی۔

بہاری، خوشی خوشی، بہی کھاتے پر ڈوری لپیٹتا ہوا،

وہاں سے چلا گیا

* * *

رام سروپ کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر تلسی کو تعجب ہوا۔

"کیوں، بابا، ایسے چپ کیوں بیٹھے ہو؟" دال کی ہنڈی چولھے پر رکھتی ہوئی اُس نے پوچھا، "آج کیا نہانا دھونا نہیں ہے؟ دیکھو تو سورج کہاں چڑھ گیا ہے!"

رام سروپ دھیرے سے اُٹھ کر، دھوتی اور ڈول لئے، پیپل کے نیچے کنوئیں پر نہانے چلا گیا

پچھلی رات جب سے بہاری نے رام سروپ کو دو دن کے اندر زمیندار کا روپیہ لوٹا دینے کی دھمکی دی ہے، بچارہ پجاری فکر سے مرا جا رہا ہے۔ دو سال ہوئے، بیوی کی بیماری میں، اُس نے ٹھاکر کے پاس سے، اپنی زمین اور باپ دادا کے وقت کا چھوٹا سا پُرانا، ٹوٹا مکان گروی رکھ کر، پونا سو روپے لئے تھے۔ کچھ روپیہ تو بیماری میں ہی خرچ ہو گیا تھا، اور باقی کا بیمار کی آخری کریا میں پُھنک گیا۔ اور تبھی سے —— ایشور کی لیلا! ——
رام سروپ زمیندار کا قرض دار ہو گیا۔ پھر بھی جب سے وہ برابر دو دو، چار چار کر کے روپیہ لوٹاتا رہا ہے —— بہاری کی مہربانی —— اصل رقم ابھی تک جوں کی توں بنی ہی ہوئی ہے
وہ سوچ رہا تھا کہ تلسی کا اب کی برس بیاہ کر دے گا۔ مو ہارا

میں ایک لڑکا بھی اُس نے دیکھ رکھا تھا۔ مگر بیاہ کے لئے روپیہ کہاں دھرا تھا؟ پہلی رقم لوٹائے بنا زمیندار سے وہ اور روپوں کے لئے نہیں کہہ سکتا تھا۔ شاید وہ کہہ بھی دیتا اور اُس کی مانگ بھی پوری ہو جاتی مگر زمیندار تو ایک شرط لئے بیٹھے تھے۔ ایشور نے اُسے تُلسی جیسی حسین بیٹی دے کر نہ جانے کس گناہ کی سزا دی تھی۔ خیر جو ہونا ہے سو ہوگا۔ مگر جیتے جی رام سروپ اپنا دھرم نہیں چھوڑے گا!

کنوئیں کا پانی آج بہت ٹھنڈا لگا۔ رام سروپ سے جسم پر اور زیادہ پانی نہ ڈالا گیا۔ آج یکایک اُس نے اپنے آپ کو بہت بوڑھا، بہت کمزور، بہت کاہل پایا۔ جنیو نچوڑتا ہوا وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

چھپری میں بیٹھی ہوئی تلسی مہابیر کے لئے چندن گھس رہی تھی اور بھیکو پاس ہی چھپری کی باڑ پر بیٹھا پوجا کے لئے بیل پاتی توڑ توڑ کر ایک ڈلیا میں رکھتا جا رہا تھا۔ رام سروپ کو آتے ہوئے دیکھ کر کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔

"تم سے کس نے کہا؟" تُلسی نے دھیرے سے پوچھا۔

"کس نے کہا؟ سارے گاؤں میں وہ کانا بکتا پھر رہا ہے اور تم کہتی ہو کس نے کہا!"

"کیوں، بابا،" تلسی نے رام سروپ سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

رام سروپ اپنی لمبی سفید چوٹی کو دھوتی کے ایک کنارے سے پونچھ

رہا تھا۔

"کیا سچ ہے، بِٹیا؟"

"کہ اپنا گھر اور زمین پرسوں نیلام ہونے والی ہے؟"

"ہاں، بٹیا۔"

"کیوں؟"

"ہری اِچّھا!"

"کیوں، بابا، کیا بات ہے، بتا دُو نا؟"

"ٹھاکر اپنا روپیہ واپس چاہتے ہیں۔ رات کو بہاری آیا تھا کل شام تک لوٹا دینے کو کہا ہے۔"

"کِتنا روپیہ لیا تھا، بابا، تم نے؟" بھیکو نے پوچھا۔

"پون سو۔"

"اور اب تک واپس کِتنے دیئے ہیں؟"

"چھتّیس،" تُلسی بولی۔

بھیکو۔ اُنگلیوں پر گنتی کرنے لگا کہ پون سو میں سے چھتیس گئے تو باقی کِتنے بچتے ہیں۔

"تو نہیں حساب کر سکے گا، بیٹا، وہ بہاری ہی جانے۔ مجھے پون سو پورے دینے ہیں۔"

"اور چھتیس جو دے چکے ہیں؟" تُلسی نے پوچھا۔

"وہ بیاج میں گئے۔"

"سچ مانو، بابا"، بھیکو نے دانت پیس کر کہا "اگر وہ سالا کانا میرے ہاتھ لگ جائے تو اُس کی گردن ہی مروڑ دوں گا۔ بچھتر روپے پر چھتیس روپے بیاج! اس کے باپ نے دیکھا تھا کبھی! آج رات کو پھوڑتا ہوں سالے کا گھر ـــــ دیکھی جائے گی۔ بہت روپیہ گاڑ گاڑ رکھا ہے پاپی نے۔"

"نہیں، بھیکو" رام سروپ بولا "ایسا کبھی نہ کرنا۔ گھر اور زمین چھن جائے گی یہی نا؟ ہری اچھا! کب ہم ساتھ لے جانے والے تھے؟"

تُلسی کی آنکھیں بھر آئیں۔ میلی سی دھوتی کے پھٹے آنچل سے بابا اور بھیکو کی نظر بچا کر، اُس نے اپنے آنسو پونچھنے چاہیے بابا تو دھوکا کھا گئے۔ لیکن بھیکو نے دیکھ لیا۔ چندن کی کٹوری اور بیل پاتی کی ڈلیا لے کر مہابیر کی پوجا کے لئے بابا پیپل کے نیچے چلے گئے۔

"تم مت سوچ کرو، تُلسی بہن"۔ بھیکو نے بھروسہ دلاتے ہوئے کہا، "کل شام تک روپے آجائیں گے"۔ بہتی ہوئی اپنی لال آنکھوں سے تُلسی نے بھیکو کی طرف دیکھا، "کہاں سے؟" اُس نے پوچھا۔

"تمھیں اس سے مطلب نہیں۔ میں نے کہہ دیا آجائیں گے، بس آجائیں گے"۔

"نہیں، بھیکو۔ تم چوری نہیں کرو گے۔"

"روپیہ تو لانا ہی ہوگا ـــــ چاہے جیسے بھی ہو۔"

"میں پیڑ کے نیچے رہ جاؤں گی، بھیکو، لیکن چوری کے روپئے کو ہاتھ نہ لگاؤں گی ...... جی تو کہتا ہے کنوئیں میں کود پڑوں۔ سب جھگڑا ہی مٹ جائے گا ..." تلسی رونے لگی۔

بھیکو ——— چیتو سونار کا بھتیجہ بھیکو ——— تلسی کو ——— رام سروپ کی بیٹی اور اپنی بہن تلسی کو ——— روتی دیکھ نہ سکا۔ اُس کی بھی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"رو مت، بہن تمھیں میری قسم ہے" اس نے کہا۔

تلسی کے آنسو دھیرے دھیرے تھمنے لگے۔

* * *

دوسرے دن شام کو اُدھاری وصول کرنے کے لئے بہاری، بہی کھاتے کی رہی کھولتا لپیٹتا، رام سروپ کے گھر آ دھمکا۔ بالنس کے چھپر کے نیچے تلسی گائے دُھ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے تلسی؟" کچھ کھانس کر بہاری نے پوچھا۔

"مہاراج گھر پر نہیں ہیں معلوم ہوتا ہے۔؟"

بہاری کی آواز سُنتے ہی تلسی کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا۔ مگر اپنے کو سنبھال کر وہ چپ چاپ دوہتی رہی۔

"اری، تو تو بولتی ہی نہیں! ہم نے کہا تیرے بابا گھر پر ہیں؟"

"نہیں ہیں،" تلسی نے نظر ہٹائے بغیر ہی روکھے پن سے

جواب دیا۔

"نہیں ہیں! اس طرح بھاگ جانے سے تو کام نہیں بنے گا۔ آج شام تک کا موقع دیا تھا میں نے۔ یا تو روپیہ واپس کرو یا گھر خالی کر دو۔ سمجھی؟"

"روپیہ مل جائے گا۔ جان مت چھوڑو۔"

"اچھا! تو بندوبست ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے!" ناک کے کنارے اُترا ہوا چشمہ، بہاری نے ماتھے پر چڑھایا "کیوں نہ ہو جس کی تیرے جیسی بیٹی ہو اُس کے پاس روپیہ کی بھلا کمی ہو سکتی ہے!"

"لالہ" ذرا منھ سنبھال کر بات کرو۔" تلسی کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ گھٹنوں میں دبی ہوئی دودھ کی ہانڈی ڈگمگانے لگی

"او ہو! تو تو ذرا ہی میں بھڑک گئی! ذرا بتا تو سہی کہ کس نے دیا؟"

اُسی وقت آنگن کا پھاٹک بجا۔ بھیکو آیا سمجھ، تلسی نے مڑ کر دیکھا۔ لکڑی ٹیکتے ہوئے بابا آرہے تھے۔ بھیکو کے آنے میں دیر ہوتی ہوئی دیکھ تلسی کا دل دھڑکنے لگا۔ نہ جانے ابھی تک وہ کیوں نہیں لوٹا۔ انگوٹھی بیچ کر شام تک آنے کو کہہ گیا تھا۔ روپئے نہیں ملے معلوم ہوتا ہے۔ دودھ کی دھار ہانڈی کے باہر ہی گری جانے لگی۔

"جے رام جی کی، مہاراج،" بہاری نے اپنی آمد جتلانے کے لئے زور سے آواز دی؛

رام سروپ کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا۔ اُس کی لکڑی پر یکایک بوجھ زیادہ ہو پڑا۔ "جے رام جی کی لالہ" اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "کب آئے؟"

"ابھی ابھی تو آیا ہوں۔ معلوم ہوا تم باہر گئے ہو۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"ذرا چودھری کی طرف چلا گیا تھا" پگڑی اُتار کر کھونٹی سے ٹانگتا ہوا رام سروپ بولا۔ "مندر کے چندے کا پیسہ اُنھیں سونپ آیا ہوں۔"

"تم نے بھی، مہاراج، ٹھاکر کو فضول ہی ناراض کر دیا۔ ایسے ایک مندر کی کون کہے، دس مندر بنوا دیتے اگر — اگر تم ذرا سمجھ سے کام لیتے۔" کانے بہاری نے تُلسی کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔

پجاری مہاراج کے گھر پر بہاری کو آیا ہوا دیکھ، پاس پڑوسی چار چھ، آدمی پھاٹک پر جمع ہو گئے۔

"ایشور اگر تمھاری جیسی سمجھ مجھے دیتا "لالہ" تو یہ سب آج کا ہے کو ہوتا،" پجاری نے کہا۔ "دو چار دن ٹھہر جاؤ، گھر خالی کر دوں گا۔"

" دو چار دن! نہیں، مہاراج، میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا یا تو روپیہ واپس کر دیا گھر خالی کرو۔" پھر دھیمے سے تُلسی کی طرف دیکھ کر "یا — یا —"

تُلسی کے پیروں سے ہانڈی چھوٹ گئی۔ گلیارے کے کوٹھے کی ساری زمین دودھ سے نہا گئی۔ ناگن کی طرح پھپکار کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، چنڈال کو بات کرتے لاج بھی نہیں آتی! اُس نے دل میں کہا اور پھر گھر کے اندر جا کر وہ رونے لگی۔

پجاری کے آنگن میں لوگوں کی بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ پھاٹک پھر سے بجا۔ بھیکو آرہا تھا "کم سے کم ایک دن تو بھی صبر کرو، لالہ، ابھی شام کے وقت کہاں جاؤں؟ کل ضرور گھر خالی کر دوں گا۔" رام سروپ نے منت کی۔

" کیوں اس کُتّے کی منت کر رہے ہو، بابا، تم بھی؟" پھیری میں داخل ہوتا ہوا بھیکو بولا "لو، ڈال دو، اس کی چھاتی پر یہ روپیے!" نوٹوں کا ایک بنڈل بہاری کے منہ پر دے مارا۔

تُلسی لپک کر باہر آئی اور اپنی سوجی ہوئی لال آنکھیں لئے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

" ذرا منہ سنبھال کر بات کرو، بھیکو سمجھائے دیتا ہوں" "اچھا نہیں ہو گا"

" ڈراتا ہے کیا بے کانے؟" چیتو سونار کے بھتیجے کی

میں خون کھولنے لگا۔

"تُلسی کے لئے تو تیرا دل بڑا دُکھتا ہے رے!" نوٹ گنتا ہوا بہاری بولا، "تو نے کیا جادو کر دیا ہے اُس پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

بہاری کے منہ پر تڑاک سے بھیکو کا ایک طمانچہ پڑا۔ اُس کی ٹوپی اُڑ کر گلے کے پیڑوں میں جا گری، اور اس کے گال پر بھیکو کی پانچوں اُنگلیاں اُمڈ آئیں۔

"بھیکو!" تاسی نے چلا کر کہا۔

رام سروپ نے بھیکو کا ہاتھ پکڑ کر الگ کھینچا۔

"بہت بکتا ہے سالہ۔ پچھتر روپیہ پر چھتیس روپے بیاج!" ہاتھ چھڑا کر، پھر بھیکو آگے بڑھا۔ "چل لے بے، کھول اپنا بہی کھاتہ اور کاٹ میرے سامنے بابا کا نام۔"

بہاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ غصہ سے نہیں، خوف سے۔ بڑی مشکل سے ڈوپٹہ سنبھال کر اُس نے بہی کھاتہ کھولا۔

بھیکو جھٹ سے، چھپری کے کونے میں بابا کی پوتھیوں کے پاس رکھا ہوا برّد اور کانچ کی ایک شیشی، جس میں چاول جلا کر بنائی ہوئی سیاہی بھری تھی، اُٹھا لایا۔ بہاری کا چشمہ، ماتھے پر سے پھر ناک پر کھسک پڑا۔ اس نے رام سروپ کے نام پر بہی کھاتے پر پچھتر روپے جمع کر دیئے اور بڑبڑاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

آنگن میں کھڑے ہوئے لوگ دل میں منا رہے تھے کہ بہاری کے دوسرے گال پر بھی ایک اور جڑ جائے۔

"پھر ٹیک سکتے جارہا ہے! ابھی کم ہوئی کیا رے؟"
بھیکو گرجا۔

بہاری نے گائے کے پاس پڑی ہوئی اپنی ٹوپی اٹھائی اور اس میں لگا ہوا دودھ اپنے ڈوپٹے سے پونچھتا ہوا بولا،

"ابھی جتنا چاہیئے اُچک لے، بھیکو۔ اگر ٹھاکر سے تجھے درست نہ کرایا تو مجھے بہاری مت کہنا"

بھیکو نے آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن تُلسی نے اس کا کُرتہ پکڑ لیا۔

"ابے جا، منھ کالا کر، بہت دیکھے ایسے ٹھاکر۔ ایک طمانچے سے ابھی تسلّی نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے۔ رسّی جل گئی پر بَل نہیں گیا!"

بڑبڑاتا، چلاتا، بہی کھاتے پر رسی لپیٹتا ہوا، بہاری پھاٹک سے باہر ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ بھیکو سے دور جاتا گیا، آواز اُس کی بڑھتی ہی گئی۔

* * *

کھانے پینے کے بعد، پجاری کے آنگن میں، پیپل کے نیچے، روز کی طرح پھر لوگ جُٹے۔ مگر آج بھگوت پاٹ نہ ہو پایا، زمیندار کے بڑھتے ہوئے ظلموں کی ہی چرچا رہی منگرو چودھری نے صلاح دی کہ مندر کا کام کچھ دنوں کے لیئے ملتوی کر دیا جائے۔ ٹھاکر کو زیادہ ناراض کرنا مناسب نہیں۔ مگر بھیکو نہ مانا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا،" وہ چمک کر بولا۔ "مندر کا کام نہیں رُک سکتا۔ ٹھاکر کو ہم لوگ اپنے بھگوان سے زیادہ مان نہیں دے سکتے۔"

لوگوں کو جوش آگیا۔ "مندر کا کام نہیں رُک سکتا" اُنھوں نے ایک ساتھ مِل کر کہا۔ "بولو، بجرنگ بلی کی جے۔"

بوڑھے پجاری، رام سروپ، کا آنگن بوڑھے بھگوان کی جے سے گونج اُٹھا۔

جے جے کار کی ہلکی سی جھنکار ٹھاکر کی کوٹھی میں بھی پہنچی، ٹھاکر کھانا کھا رہے تھے۔ اُن کی تیوری چڑھنے لگی۔

"یہ کیا جھگڑا مول لے رہے ہو؟" اُن کی بیوی، رادھا نے دھیرے سے پوچھا۔

ٹھاکر کی عادتوں اور اُن کے سلوک سے رادھا پیلی پڑ گئی تھی اُس کی منتوں کو ٹھکرا کر، اس کی آنکھوں کے سامنے، ٹھاکر نے ہر طرح کے بُرے کام کئے تھے۔ جب اپنے پتی دیوتا کے پیر وہ دھوتے دھوتے تھک گئی اور دیوتا نے اپنی پجارن کی سُدھ نہ لی تو آخر میں ہار کر اپنے پانچ برس کے اکلوتے بیٹے کمل میں ہی اطمینان ڈھونڈھنے کی رادھا کوشش کرنے لگی۔

"کون جھگڑا مول لے رہا ہے؟ — میں یا وہ سونار کا بچہ، بھیکو؟" ٹھاکر زور سے تمک اُٹھے۔

پاس ہی بلی سے کھیلتا ہوا کمل گھبرا کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنے باپ کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر کانپنے لگا - وہ جان گیا کہ پتاجی کے غصّے کا بادل پھٹنے والا ہے -

"سالے کی یہ ہمّت کہ میرے کارندے پہ ہاتھ اُٹھائے! کھال کھنچوا دوں گا اُس کی - سمجھا کیا ہے اُس نے -"

"سُنا تھا، بہاری، پُجاری مہاراج کا گھر قرق کرنے پہنچا تھا؟" رادھا نے پوچھا -

"قرق نہیں کرے گا، چھوڑ دے گا؟ دو سال ہوتے آئے، وہ پُجاری کا بچہ میرا روپیہ واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا - اور اُلٹا گاؤں بھر کو میرے خلاف بھڑکاتا پھرتا ہے"-

"تمھارا یہ بہاری ہی اصل نادر ہے جس مہابیر کی دعا سے اپنے کو بچے کا منھ دیکھنا نصیب ہوا - اُسی کی پُجاری کی بیٹی پہ ڈورے ڈالتے پاپ نہیں لگے گا؟"

"تم چپ رہو جی،" ٹھاکر نے ڈانٹ دیا "بڑی آئی پاپ پن سکھانے - میرے ناک میں لیموں نچوڑ کر، میرے ہی آنکھوں کے سامنے، سالے گاؤں والے مندر بنا رہے ہیں! کل ہی سے دیکھ لینا - میں بھی کوئی کام شروع کرتا ہوں - مندر کے لئے ایک مزدور نہیں ملنے دوں گا - سارے گاؤں کو بیگار میں گھسیٹوں گا -"

بیچارہ کمل چپ بیٹھا ہوا کبھی ماں کے چہرے کو تاکتا تھا - اور کبھی

باپ کے۔

"تمھیں میری قسم ہے" دادھا نے سمجھانے کی کوشش کی، "دیکھو بات مت بڑھاؤ۔ دھرم کا معاملہ ہے۔ بھیکو کو تم جانتے ہو کیسا اُجڈ ہے۔ مرنے مارنے کو نہیں ڈرتا۔ کوئی سگا سمبندھ جو نہیں ہے اس کا اس دُنیا میں۔"

"بھیکو؟ وہ بھی سالا کل میری بیگار میں ہوگا۔" ٹھاکر تھالی دور سرکا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس سے اور اس بچاری سے اگر میں نے کُدالی نہ چلوائی تو میرا نام نہیں۔"

✻ ✻ ✻

گاؤں میں جتنے ریزا، قلی تھے سب زمیندار کی بیگار میں پکڑے گئے۔ کدالی، پھاوڑا لے لے کر اُنھیں آمرائی والے تالاب پر طلب کیا گیا۔ مئی کی تیز دھوپ میں تالاب سوکھ چکا تھا۔ زمین میں چوڑی چوڑی دراڑیں پڑ گئیں تھیں۔ گاؤں کی کچھ بھینسیں یہاں وہاں کیچڑ میں بیٹھی کروٹیں لے رہی تھیں...... اسی تالاب کے بیچ ٹھاکر کا رنگ محل بنے گا۔ ٹھاکر نے حکم دیا کھدائی شروع کر دی جائے۔ تالاب کے پیٹ میں کدالیاں پڑنے لگیں۔

"مگر، سرکار" نمک حلال بہاری بولا، "ریزا، قلی لے لینے سے مندر کا کام تو نہیں رُکا۔ وہ بدمعاش بھیکو انھیں پھسلا کر رات رات کے مندر کی دیواریں چڑھا رہا ہے۔ دھرم کا کام سمجھ کر

لوگ جی جان سے اُس کی مدد کر رہے ہیں۔"

ٹھاکر کے کلیجے میں تیر سا لگا۔"کیا مندر بن رہا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔" معلوم ہوتا ہے جب تک اُس سونار کے بچے کی کمر نہ توڑی جائے گی وہ راستے پر نہیں آئے گا...... اچھا، بہاری، دیکھو کل سے بھیکو اور رام سروپ کو بھی بیگار میں گھسیٹو۔ دھوپ میں جب کُدالی چلائیں گے، سالوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ زمیندار سے بائی کرنے کا کیا پھل ہوتا ہے اُنھیں ابھی چکھائے دیتا ہوں۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا، سرکار،" کانا ذرا مُسکرا کر بولا۔ "رام سروپ اور بھیکو جہاں بیگار میں کھینچے گئے کہ گھر پر تُلسی اکیلی پڑ جائے گی۔"

دوسرے دن، بودرا کے بھگوان کا پُجاری تو بچارا کندھے پر انگوچھا ڈالتا ہوا زمیندار کی بیگار میں جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا، لیکن بھیکو سینہ تان کر آنگن میں کھڑا ہو گیا۔

"چینتو سونار کا بھتیجہ اور ٹھاکر کی بیگار میں!" وہ بولا۔" ناممکن ہے۔"، بہاری اور اس کے ساتھ بُلانے آئے بھئے دونو کر سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گئے۔" جاؤ، کہہ دو اپنے ٹھاکر سے کہ بھیکو نہیں آتا۔"

منگرو چودھری، رام سروپ اور تُلسی نے بھی اس سے منت کی کہ وہ چلا جائے، مگر بھیکو نہ مانا۔

تب ٹھاکر بھوپ سنگھ کو خود آنا پڑا۔ جودھپوری بر جیس پہنے،

موتی پر چڑھے، ہاتھ میں چابک لئے وہ بھیکو کے آنگن میں گھس آئے
بھیکو اور پجاری کے آنگن کے سامنے بھیڑ لگ گئی۔
"کیوں بے سالے سونار کے بچے، یہ کیا بکھیڑا کھڑا کیا ہے؟" ٹھاکر گرج کر بولے۔ "سیدھی طرح چلتا ہے یا مار کھائے گا۔؟"
بھیکو کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ "ٹھاکر، گالی مت دو" اُس نے کہا۔ "مجھ سے تمھاری بیگار نہیں بنے گی۔"
ٹھاکر گھوڑے سے اُتر پڑے۔ "سالا منھ لگتا ہے، اتنی ہمت!" اُنھوں نے کہا، اور لگے کوڑے سے بھیکو کو مارنے۔
بھیکو تلملا اُٹھا۔ "ٹھاکر۔ دیکھو — ٹھاکر — کہے دیتا ہوں — ٹھاکر —"
تُلسی کے سامنے، رام سروپ کے سامنے، پیپل والے مہابیر کے سامنے، بودرا کے ہر آدمی کے سامنے آج بھیکو کو زمیندار نے کوڑے سے پیٹ دیا — اور بھیکو سے کچھ بن نہ پڑا ... بودرا میں ٹھاکر کی دھاک پھر سے بندھ گئی۔
مار سے گھائل ہو کر زمین سے گرا ہوا بھیکو اُٹھا، اور دھیرے دھیرے تالاب کی طرف چلنے لگا۔
بھیکو کے پیچھے رام سروپ تھا۔ اور رام سروپ کے پیچھے، دو نوکروں کو ساتھ لئے، سولہ کمانی والا سفید چھاتہ لگائے ہوئے بہاری تھا۔

بوڑھا رام سروپ پیپل کے نیچے بیٹھا، چلم پیتا ہوا، مہابیر کی مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے بھگوان کیوں روٹھے ہیں، اُس نے سوچا، کہ جس دن سے مہابیر کا مندر بنانے کی سوچی اُس دن سے برابر کوئی نہ کوئی تکلیف اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہی رہا ہے۔ کہیں بھگوان ہمارا امتحان نہ لے رہے ہوں۔ ان کی بھی لیلا عجیب ہے!'

"بابا، رسوئی تیار ہے،" تُلسی نے آکر کہا، اور مہابیر کے پاس دِیا رکھنے لگی۔

بازو میں پڑی ہوئی لکڑی کا سہارا لے، بابا اُٹھے۔ دن بھر کی دھوپ اور کھدائی کی محنت نے جسم کو توڑ دیا تھا۔

"جا، بیٹا، بھیکو کو بھی بُلا لا۔ بیچارے پر آج بُری گذری ہے۔"

گائے کے پاس کا پھاٹک کھول کر تُلسی نے بھیکو کے آنگن میں جا کر دیکھا، ایک کھٹیا پر پڑا ہوا وہ چیٹا رہا تھا۔ سارا دن دھوپ میں کدال چلانے سے ہاتھ پیر، پیٹھ اکڑ گئی تھی، اور صبح کی مار سے جسم پھول اُٹھا تھا۔

"بھیکو بھیّا" تلسی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پکارا۔

بھیکو نے آنکھیں کھول دیں۔

"چلو کھانے کے لئے۔ بابا بُلا رہے ہیں۔"

"نا، بہن، بھوک بالکل نہیں ہے۔"

"تھوڑی سی سوجی کھا لو، میں یہاں لائے دیتی ہوں۔"

"بہن تم مت تکلیف کرو، میں آج نہیں کھاؤں گا۔"

"نہیں کھانے سے کیسے کام چلے گا؟ کل پھر جو بیگار پہ جانا ہے نا" گھر سے بابا کی آواز سن کر "دیکھو، بابا پکار رہے ہیں۔ اُٹھو۔"

بھیکو کراہتا ہوا اُٹھ گیا، اور تُلسی کے ساتھ ہولیا۔

ہر روز کی طرح آج بھی کھانے پینے کے بعد، رام سروپ کے آنگن میں، پیپل کے نیچے، گاؤں کے کچھ لوگ جمے۔ مگر زیادہ بھیڑ نہ ہوپائی ٹھاکر کے ڈر سے بہت سے لوگ، اپنے اپنے گھروں میں پڑے ہوئے، ٹھاکر کو کوستے رہے۔ ریزا، فضلی کی بھی آج رات کو مندر کے کام پر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ صبح بھیکو کے پٹ جانے سے سارے بودرامیں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے، مہاراج، مندر ادھورا ہی رہے گا!" منگرو چودھری نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"ہری اچھا!" رام سروپ چلم میں تمبا کو بھرنے لگا۔

"کلجگ ہے، چودھری، کلجگ! بھگوان کا نام لینے کی بھی منائی ہے!" بھولا نائی بولا "اگر میرا بس چلے تو اس گاؤں میں ایک پل بھی نہ رہوں۔"

بابا کی چلم کے لئے تُلسی چمٹے میں آگ لے آئی۔

یکایک کنوئیں کی دیوار سے ٹیک کر لیٹا ہوا بھیکو اٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ مندر بنے گا، چودھری!" وہ بولا۔ "مہابیر کا مندر بنے گا.... لیکن اس پر قربانی دینی ہو گی" بھیکو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دھیرے دھیرے تلسی کی گائے کے پاس والے پھاٹک سے ہوتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

اس کا مطلب شاید لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر بابا کی چلم پر آگ رکھتے ہوئے تلسی کا ہاتھ کانپ اٹھا۔

"معلوم ہوتا ہے کوئی ان ہوتی بات ہونے والی ہے،" رام سرن بولا۔ "شام سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے —"

"صبح کا واقعہ کیا کم ہوا، مہاراج، جواب اور باقی ہے؟" چودھری نے کہا۔

"وہ تو مہابیر جی ہی آڑے آئے سمجھو،" بھولا نائی کہنے لگا۔ "نہیں تو بھیکو کھڑا چیر دیتا ٹھاکر کو۔"

"ذرا دھیرے بولو، کاکا،" تلسی گھبرا کر بولی "یہاں تو ہوا کے بھی کان ہیں!"

* * *

بودرا کے زمیندار ٹھاکر بھوپ سنگھ کے رنگ محل کی دیواریں امرائی والے تالاب کے بیچ، بڑی تیزی سے چڑھ رہی تھیں۔ ٹھاکر کے لئے یہ رنگ محل تیار کر کے بودرا کے رہنے والے خود اپنے پیروں پر کلھاڑی مارے جا رہے تھے۔ اسی رنگ محل کی چار دیواری کے اندر بودرا کی ابلاؤں کی لاج، بودرا کے ان دا تا

کے ہاتھوں بکنے والی تھی۔

تالاب کے کنارے پر، آم کے پیڑ کے نیچے، کپڑے کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ٹھاکر بیگار میں لائی ہوئی چند عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بازو میں کھڑا ہوا سبھارہی، ہاتھ میں برف کے پانی کی شیشی لئے ٹھاکر کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بھیکو اور رام سروپ نے زمین میں کدالی مارتے مارتے یہ سب کچھ دیکھا۔ پیاس کے مارے اُن کا منھ سوکھا جا رہا تھا۔ بھیکو نے کدالی رکھ کر، تھوڑی دور پر پڑے ہوئے تنبے سے۔ پیتل کے ایک لوٹے میں پانی اُنڈیل رام سروپ کو دیا۔

"کیوں رے، یہ ٹلے بازی کیا کر رہا ہے؟" ٹھاکر نے چلا کر کہا۔

پانی پی کر بھیکو نے پھر کھدائی شروع کر دی۔ آٹھ دن کی بیگار میں ہی وہ سوکھ گیا تھا۔ دھوپ سے بدن کالا پڑ گیا تھا۔ اُس کی جسمانی کمزوری اور دماغی تکالیف کا فائدہ اُٹھا، کانا سبھاری تک اب بھیکو پر — چیتو سونار کے بھتیجے بھیکو پر — حکم چلانے کی ہمت کر بیٹھتا تھا۔ اور بیچارہ رام سروپ! ..... کدالی تو وہ چلا رہا تھا۔ لیکن اُس سے زمین نہیں کھدتی تھی۔ ہر مار میں مشکل سے تولہ بھر مٹی نکال پاتا۔ پاس کے لوگوں کو رام سروپ کی حالت دیکھ کر اُس پر بڑی دیا آتی تھی "برہمن دیوتا کی ہائے بُری ہوتی ہے،" وہ لوگ آپس میں کہا کرتے "دیکھنا، ٹھاکر کا گھر اُجڑ جائے گا۔"

بھیکو نے دیکھا، موتی پر چڑھے، ٹھاکر جا رہے ہیں۔ اُن کے

پیچھے سولہ کمانی والا سفید چھاتا بھی جا رہا تھا۔ ہر روز جب تک سورج پچھم والی پہاڑی کے پیچھے نہیں جا چھپتا تھا اور گاؤں کے جانور تالاب کے پاس والی کچی سڑک پر دھول اُڑاتے واپس نہیں لوٹتے تھے، بہاری لوگوں کو بیگار سے نہیں چھوڑتا تھا۔ اور نہ خود ہی کبھی ایک منٹ کے لیے وہاں سے ہٹتا تھا۔ لیکن آج، نوکروں کی نگرانی پر رکھ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر، موتی کے پیچھے پیچھے وہ گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا۔

جب موتی اور سفید چھاتا آم کے پیڑوں کی آڑ میں چلے گئے تو لوگوں نے اطمینان کا ایک سانس لے کر تھوڑی دیر کے لئے کام بند کر دیا کسی نے پانی پیا اور کسی نے چلم سلگائی، سورج ابھی پہاڑی کے تین ہاتھ اوپر تھا۔

تھوڑی دیر بعد —— زمیندار کے نوکروں کے بہت ہاتھ پیر جوڑنے پر —— جب لوگ کام پر پھر سے لگے ہی تھے۔ کہ بھولا نائی کا منجھلا ناتی دوڑتا ہانپتا، آکر رام سروپ سے بولا:

"دادا تم کو جلدی بُلاتے ایں، ٹھاکل۔ —— ٹھاکل تمارے گل میں گھس کل —— تلچی بہن کو مال لے ایں!"

رام سروپ کے ہاتھ سے کُدالی چھوٹ گئی —— وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا

"کیا بات ہے، بابا؟" بھیکو نے پاس آکر پوچھا۔

آس پاس کے لوگ کام چھوڑ کر وہاں جمع ہو گئے۔

"تلسی!.... ٹھاکر —— ٹھاکر میری تلسی کو رام سروپ کے منہ سے آواز نکلی۔

غصہ سے بھیکو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ اس طرح کانپنے لگے جیسے آندھی میں کٹی ہوئی ڈالی "بس بہت ہو گیا!" اس نے دانت پیس کر کہا "آج ٹھاکر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا ــــ" اور کدالی لے کر آندھی کی طرح "وہ گاؤں کی طرف لپکا"

آگے آگے بھیکو دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اور پیچھے پیچھے رام سروپ اور دوسرے سب لوگ تھے۔

جب تک بھیکو رام سروپ کے پھاٹک پر پہنچا، سارا بودرا اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ پیپل سے موتی بندھا ہوا تھا۔ اور پاس ہی میں کانا بہاری کھڑا تھا۔ جو آتی ہوئی بھیڑ دیکھ، باڑی پھاند کر بھاگ نکلا۔

گھر کے اندر سے کچھ گرنے اور تلسی کی دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

بھیکو کدالی لئے چھپری کے اندر گھسا۔ کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے کس کر ایک لات جمائی اور دروازہ توڑ گرایا۔ تیر کی طرح اندر لپک کر اس نے دیکھا ٹھاکر .... بھیکو نہ سنبھل سکا ــــ نہ سنبھال سکا۔ اس پر اس وقت بھوت سوار تھا۔ "چنڈال!" اس نے زور سے للکار کر کہا۔ اور کدالی اٹھا کر کھٹیا پر دے ماری، ٹھاکر کا سر پھٹ گیا اس کی آنکھیں اور زبان باہر نکل آئیں۔

"بھیکو!" تلسی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بھیکو کے پیروں سے لپٹ گئی۔ بھیکو تھوڑی دیر ٹھاکر کی لاش کو آنکھ پھاڑے دیکھتا رہا اور

پھر یکا یک پاگلوں کی طرح قہقہہ مارنے لگا۔

یودرا کے رہنے والوں کا رام سروپ کے آنگن میں میلہ لگا ہوا تھا۔

بھیکو نے ٹھاکر کی خون آلود لاش کھینچ کر باہر نکالی۔ بولو،

بجرنگ بلی کی جے!" اُس نے زور سے آواز لگائی۔

آنگن میں جمع ہوئے لوگوں کے دل دھڑکنے لگے۔

لاش کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا۔ بھیکو پیپل کے نیچے، مہابیر کے پاس جا پہنچا "مہابیر کو قربانی چاہیئے تھی" اس نے کہا "اور یودرا کے زمیندار ٹھاکر بھوپ سنگھ کی لاش یودرا کے بھگوان پر چڑھا کر وہ پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

پچھم والی دھند ھکتی پہاڑی پر سسکتے ہوئے سورج کے لال عکس میں مہابیر کے چرنوں پر چڑھائی ہوئی قربانی یودرا کے رہنے والوں کو خوب جچی۔ "اب مہابیر کا مندر بن جائے گا!..... بابل۔ چودھری اب مہابیر کا مندر بن جائے گا!

بولو، بجرنگ۔ بلی کی جے ———" اور پھر سب لوگوں نے ایک ساتھ مل کر کہا:

"بجرنگ بلی کی جے"

سراج کا سہارنپور

"کب تک لوٹیے گا؟"

"پیر کی صبح آجاؤں گا۔"

"کیا کوئی ضروری کام ہے؟"

"ہاں، سردار امر سنگھ کو انشور کرنے جارہا ہوں۔ سہارنپور کے وہ ایک بڑے زمیندار ہیں۔ بڑا بزنس ہاتھ لگنے کی امید ہے۔"

سراج احمد اپنی بیوی کی کمزوری بخوبی جانتے تھے۔ جب کسی کام میں وہ اڑنگا لگاتی یا کسی کام کے لئے اپنے شوہر کو روکتی ٹوکتی، وہ جھٹ اپنے "بزنس" کا بہانا بتا کر اس کی بات کاٹ دیتے تھے۔ آج سات سال سے۔ جب سے اُن کی شادی ہوئی ہے۔ سراج احمد انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ اُن کا بہت سا

وقت گھر کے باہر ہی گذرتا ہے۔ کبھی کبھی لاہور سے باہر اُنھیں دور پر بھی جانا ہوتا ہے۔ اصل میں بات تو یہ تھی کہ اُن کی طبیعت گھر پر نہ لگتی تھی۔ کچھ تو اُنھیں سفر کی من مختاری پسند تھی۔ کچھ پینے کا شوق تھا اور پھر کچھ بت پرستی کا بھی۔

"کھانا کھا کر جایئے، ابھی تیار ہوا جاتا ہے۔" اُن کی بیوی نے کہا۔

"نہیں رہنے دو۔ اسٹیشن پر ہی کھا لوں گا۔"

منھ میں سگریٹ دبائے۔ ہاتھ میں چھوٹا سا سوٹ کیس لئے سراج احمد ــــ نکل پڑے۔ نکڑ پر تانگہ کھڑا تھا۔ اُسی پر سوار ہو لئے۔

"کہاں کو حضور؟"

"مال روڈ!"

وِنڈسر ہوٹل سے پہلے تو انھوں نے تین بوتلیں بیئر کی خریدیں اور ایک گولڈ فلیک کا ڈبہ

"لارنس گارڈن، حضور؟"

"نہیں، جمنا داس کی چال!"

تانگا گلی میں مڑ گیا۔ سراج نے پہلی بوتل تو تانگے میں ہی کھول کر منھ میں اونڈیل دی۔

"دیکھو، تانگہ والا!"

"جی، حضور!"

"لاہور دیکھا ہے؟"

"دیکھا کیوں نہیں، حضور"

"کسی کو جانتے ہو؟"

"جانتا کیوں نہیں، بیس برس ہو گئے تانگہ چلاتے، اتنا بھی ——"

"کون ہے؟"

"حضور کے لائق ہی ہے۔ معمولی چیز نہیں —— اِنے گنوں کے پاس ہی جاتی ہے کہیئے تو ——"

"کیا عمر ہے؟"

"ہو گئی، یہی، بس، بائیس، تیئس"

"لا سکتے ہو؟ —— ابھی؟"

"کوشش کر کے دیکھتا ہوں، حضور! پر ذرا مہنگی چیز ہے —— حضور۔"

"تم اس کی پرواہ مت کرو۔ بس، روک لینا۔ ہاں، اُس قندیل کے پاس، بس ——"

جمنا داس کی چال کے پاس تانگہ رُک گیا، لکڑی کا پُرانا پھاٹک کھڑا تھا۔ کنڈی ہٹا کر پٹ کھول دیا گیا۔ سراج تانگے والے کو ساتھ لے، اندر داخل ہوا۔ قریب آدھی چال کی روشنی گُل ہو چکی تھی۔ برآمدے میں چوکیدار لیٹا تھا۔ جو

آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بجلی کی روشنی میں سراج کو وہ پہچان گیا۔

"کمرا کھلا ہے؟" سراج نے پوچھا۔

"نہیں، صاحب، ابھی کھولے دیتا ہوں۔"

چوکیدار نے بازو والا، پندرہ نمبر کا کمرہ کھول دیا! تانگے والے نے سوٹ کیس اندر لا کر رکھ دیا۔

"تو تم جاؤ۔ تانگے والا۔" سراج نے اُسے پانچ روپے کا ایک نوٹ پکڑا دیا۔ "جاؤ لے آؤ —— رات بھر کے لئے۔ دیکھو، جلدی کرنا۔"

"ابھی لایا، حضور!" کہہ کر تانگے والا چل دیا۔

سراج نے بتی جلائی، کپڑے اُتارے اور دوسری بوتل نکالی...

پرانا سا لوہے کا ایک پلنگ، ایک چٹائی، تین پیروں والا ایک ٹیبل، کپڑے کی ایک آرام کرسی، پانی کی صراحی، ٹوٹا ہوا گلاس، شراب کی کچھ خالی بوتلیں، میلا سا ایک تولیہ اور دیواروں پر پان کی پیک —— یہی سراج کا سہارنپور تھا۔ اکثر ہفتہ کے آخیر، اگر دورے پر جانا نہ ہوا، تو سراج احمد اس کمرے میں جو انھوں نے کرایہ پر لے رکھا تھا، آجایا کرتے، اور دل کھول کر شراب کباب اُڑاتے تھے۔ ہر دفعہ ساتھ میں کوئی نہ کوئی ضرور ہوتی۔

تیسری بوتل کھولتے کھولتے چوکیدار ہوٹل سے کھانا

بھی لے آیا۔

⁂ ⁂ ⁂

آدھی رات کو وہی تانگہ مال روڈ پر پھر سے چلا۔

⁂ ⁂ ⁂

چار بج گئے۔ پانچ بج گئے ــــــ چھ بج گئے.. لیکن سراج نے دروازہ نہ کھولا۔ تانگے والا پریشان ہو گیا صبح ہونے سے پہلے اس عورت کو واپس پہنچا دینے کا۔ اُس نے قرار کیا تھا ــــــ اور اب تو دن نکلنے کو تھا۔! تانگے والا سراج کے کمرے کے پاس جا کر کُنڈی کھٹکھٹانے لگا۔

"بس، حضور، اب تو چھوڑ دیجئے ــــــ دن نکلنے کو ہے!" مگر کوئی جواب نہ ملا اور آدھ گھنٹہ صبر کر لینا تانگے والے نے مناسب سمجھا۔ آدھ گھنٹے بعد بھی کنڈی کھٹکھٹانے پر کوئی جواب نہ تھا۔

"حضور، جانے دو، حضور ــــــ بہت دیر ہو گی.... دن نکل آیا! حضور.... حضور...."

اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ بالکل سناٹا تھا۔ تانگے

والے کے کان ٹھنکے، وہ چلتا بنا۔

* * *

اس دن شام کو جب دروازہ توڑا گیا، کمرے کے اندر فرش پر دو لاشیں لہو میں شرابور پائی گئیں ایک سراج احمد کی تھی اور دوسری تھی ان کی بیوی کی۔